

افکار پریشاں

طنز و مزاح



جسٹس ایم آر کیانی

جسٹس ایم آر کیانی

پریشانی خاطر

کہنے جاتے تو ہیں پردیکھے کیا کہتے ہیں

اگرچہ آج افکار پریشاں کا تیسرا جنم دن ہے مگر آپ کی اجازت سے میں اسے برسی کی حیثیت دینا چاہتا ہوں۔ اب قاتل پڑھنے کا وقت آ گیا ہے۔ قاتل کی خبیالات کو تین سال سے زیادہ پریشاں ندرکھے۔ تین سال کے بعد دونوں میں سے ایک کو قاتل کر دینا چاہیے یا ان افکار کو جو پریشاں ہیں یا اس کو جو ان سے پریشاں ہے۔

اگرچہ آج کی تقریر کا عنوان بھی دستور سابق کے مطابق افکار پریشاں ہے لیکن مناسب ہوگا کہ اس کا دوسرا نام یہ رکھیں۔ مجھے شرم آتی ہے مگر.....

مگر کے آگے کئی نسلے ہیں اس لیے کہ شرم کئی باتوں سے آسکتی ہے۔ اک ذرا انسان میں شرم آنے کی ہمت چاہیے۔

اسے وہ لوگوں! اجماع ایمان نہیں لائے غور سے سوچو کیونکہ میں نے یہ تقریر کھینچنے وقت صحت سے کام لیا ہے۔ صحت اس طرح کہ جب میرے پریشاں افکار بکھرتے ہیں تو دور دور تک پھیل جاتے ہیں مجھے بھی اس کا پتہ نہیں چلتا کہ ان کے رستے میں کسی وادی قتل سے گزرتے ہوئے کتنی قوتیں ہیں پریشاں ہو گئی ہوں گئی۔ یہ کہنا تو شاید بجا نہ ہو کہ "یا اے اہل اذلو اسما انکم" اے وادی قتل کے رہنے والو! داخل ہو جاؤ اپنے گھروں میں کیونکہ افکار پریشاں کے سلیمان شکوہ جلوس قوتیں کو روکتے چلے آ رہے ہیں۔ دراصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔ میں ایک پریشاں خیال کو بڑی مشکل سے گرفتار کر کے لفظوں کا جامہ پہتا ہوں تاہوں پھر کاٹ دیتا ہوں اس لیے کہ یہ پہلے دھوئے کے حلق ہے اور کوئی دھوین ناراض ہو جائیگی۔ پھر کچھ اور کچھ کاٹ دیتا ہوں کیونکہ یہ چھامت کے حلق ہے اور ممکن ہے کہ کسی گتے یا تانی کی ناراضی کا باعث بن جائے گی۔ اسی عنوان کا اصل مسودہ صبح و ترسیم سے ذبحی پڑا ہے۔ چودہ دھم شہید ہیں اور ایک سو چودہ خلیفہ۔ اس میں نو آیات ہیں اور باقی روایات اس کے کھینچنے میں دس دن لگے ہیں اور افکار

افکار پریشاں

(طنز و مزاح)

جسٹس ایم آر کیانی

ویسے کے ویسے ہی پریشان ہیں۔

ابھی تک میں اپنے افکار پریشان کو قبح کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں اور انشاء اللہ اس مضمون کے آخر تک آپ کو پریشانی میں مبتلا رکھوں گا۔ آپ نے کافی آرام کے دن کاٹے ہیں۔ تجسیم ہند کے بعد آپ کو اس قصبے نے دیکھی پریشان نہیں کیا کہ ”کاڈ آدو غرقت“ یا کرسٹ روٹنی اور جیز کام آئی۔ گاڑی دایرمل وہی رہی صرف انجی بدلا۔ نکٹ پیچھے والے بھی وہی رہے اور نکٹ دیکھنے والے بھی وہی۔ آپ نکٹ خرید کر سڑک کرتے رہے گاڑی آج پھر آپ کے افکار دیکھی پریشان نہیں ہوئے بلکہ آپ نے افکار کو اپنے نزدیک ہی نہیں آنے دیا تاکہ جلاوہ پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔ آپ کے سر کی قسم آپ میں بہت مہربانہ مگر میں آج آپ سے بارہ سال کا بدلہ لے سکوں تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ میرے افکار تو شروع ہی سے پریشان رہے۔

کچھ اپنے بارے میں

میں اپنا تعارف خود کرنا مناسب سمجھتا ہوں.....

ایک نویں جماعت کے طالب علم نے مجھے خط لکھا کہ جب بھی آپ کی تقریر اخبار میں آتی ہے تو ہمارے گھر میں اس بات پر بحث ہوتی ہے کہ آپ کا اصلی نام کیا ہے؟ یا ام آرمیا تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کبھی ہم رمضان کیجھے ہیں کبھی ملک رنجیت۔ آپ اپنے ہاتھ سے لکھیں آپ کا اصل نام کیا ہے؟ یا کا عید ہمارے گھر میں یہ جھگڑا نہ ہو۔ میں نے جواب دیا کہ یہ خط اس نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر ہا ہوں اور میرا نام محمد رحم ہے۔ اور جو اس کے بعد ملک کرے وہ کافر ہے نیز چونکہ اس کا احتمال ہے کہ اس کے بعد آپ کے گھر میں میرے قد و قامت پر جھگڑا اٹھے تو واضح ہو کہ خود تو بال سے زیادہ پارک ہوں مگر میری بڈیاں حواری سے زیادہ چتر ہیں جن پر دھلی ہاتھوں کے ٹک نہیں گزرتے۔

اس ٹکے کی یہ بات کہ شخص ایم آر کیا کی کچھ معنی نہیں رکھتا ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ چکی جاہت ہوئی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ (who is who) کے نام سے بعض پبلشرز ایک ڈائریکٹری چھاپتے ہیں جس میں بقول ان کے مشہور لوگوں کے نام ہوتے ہیں ان کے نزدیک یہ بات مسئلہ ہے کہ وزیر مشہور ہوتے ہی ہیں۔ سچ بھی مشاہیر میں سے ہیں۔ اور اگر وہ قصور کے ساتھ روئے بھی سمجھ دیں تو مزید شہرت کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ پچھلے ہفتے اپنی ہسٹری شیٹ کی صفحے کے لیے میرے پاس افغانستان سے ایک خط آیا۔ ہسٹری شیٹ میں میرا نام ملک الرحمن کیا فی رون تھا جو میرے بڑے بھائی کا نام ہے وہ بھی ایم آر کیا کی ہیں۔ ان کے دوا کے بھی ایم آر کیا کی ہیں۔ ہسٹری شیٹ میں میری سیاسی سرگرمیوں کا ذکر تھا اور یہ بھی کہ غلام سال میں صوبہ سرحد میں وزیر صحت ہوا جس

سے صحت کچھ ابھی ہو گئی۔ مگر 1950ء وزیر مواصلات ہوا اور پھر سارے ویسٹ ٹوٹ گئے۔ اور 1958ء میں سیاست سے جزار ہو کر میں چیف جسٹس ہو گیا۔ القصد سوائے آخری کتاب کے باقی سارے سیاسی کتاب میرے بھائی کے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ میرا ایڈریس پیریم کورٹ آف پاکستان لکھا تھا جہاں میرے سارے کا بھی سانس پھولنے لگتا ہے۔ اس لیے میں نے کہا کہ اسے وہ لوگو جو اپنے اچھے بھلے نام کو چھوڑ کر قرآن مجید کی طرح الف لام بیہم استعمال کرتے ہو صبر حاصل کرو ورنہ کسی دن بغیر تھوڑے کے چیف جسٹس یا وزیر بن جائو گے۔

دوسرا قصہ زیادہ نازک ہے یعنی میرا نام کیوں رکھا گیا اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھ سے پہلی ایک لڑکی کا نام کا فورہ روچکا ہے۔ میرے ایک دوست کی بیوی نے ایک دلہا اپنے مہمانوں سے میرا تعارف اس طرح کرایا کہ میرے شوہر ان کا ہمیشہ ذکر کرتے تھے۔ مدت کے بعد جب میں نے ان کو پہلی بار دیکھا تو اپنے شوہر سے پوچھا کیا یہی ہیں آپ کے ”رحم“ جس سے میں نے قیاس کر لیا کہ ان کے شوہر نے ضرور کوئی رشتہ کی بات کی ہو گئی۔

بات یہ کہ میرا اصلی نام جلاغر خان تھا۔ (آپ کے کاغذ کے لیے یہ بات کہتا ہوں کہ پشاور کے مشہور ڈاکو کا نام مہمان خان تھا) جب پانچ چھ سال کی عمر میں قلعہ کے موقع پر والد مرحوم نے ہم تینوں بھائیوں کے لئے بوٹ منگوائے لیکن ہمیں قصبے ہاتھ سے نہیں آتے تھے۔ والدہ نے سفارشات والد سے کہا کہ بچوں کو قصبے ہاتھ سے سکھائیے۔ انہوں نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔ اگر میں تمہارے لیے دوسری ماں لاؤں تو تم اس کو سلام کرو گے۔ بڑے بھائی نے کہا۔ ”ہاں اور والد مرحوم نے ان کے قصبے ہاتھ دیے۔ میری باری آئی تو میں چپ ہو گیا۔ والد نے پھر سوال کیا۔ میرے بھائی نے کان میں کہا کہ کہہ دو نا اس میں کیا ہے؟ تمہارے سلام سے کچھ سچ سچتی ماں تو نہیں آ جائے گی۔ میں نے کہا اگر اتنی تیزی بار جب والد نے سوال کیا تو میں نے کہا کہ سلام تو میں نہیں کروں گا۔ میرے قصبے کھلی دیے گئے..... اور میں قصبے سے باہر نکل آیا۔ اور رونے لگا۔ اس سے زیادہ کیا کر سکتا تھا۔ والد مرحوم ان دنوں شاہماہد سے رہتے تھے اور ”من و گرز و میدان و افراسیاب“ والا مصرعہ ان کو پسند تھا۔ میرے نکلنے کے بعد ٹھٹھکا کر بیٹھے اور کہنے لگے کہ یہ بھی بڑا رحم نہ پھرتا ہے اپنے باپ کو دوسری شادی کی اجازت تک نہیں دیتا۔ اس دن سے جلاغر خان کی بجائے میں رحم خان ہو گیا اور جب ذرا مہذب ہوا تو نام کے ساتھ لگا لگا لیا اور خان کا ٹاٹ دیا۔ مگر

”میرے بچوں کے قصبے ابھی تک کھلے ہیں۔“

پشاور سے میرا تعلق صرف چار سال رہا ہے اور وہ میری زندگی کے بہترین سال تھے۔ میں نے زندگی کی چار بھاریں یہاں

گزارشیں ہیں اور اس شہر کے جن گھاتوں میں یہ گزریں وہ اپنے روزِ دکاؤں، شامی باغ اور دُزر باغ تھے۔ ایک دن ہم کالج سے شہر کی طرف جا رہے تھے۔ دو بیلے سٹیشن کے پاس سے گزر رہا کچھ مسٹریدل گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں نے کہا کہ یہ چیف کشمیری مخصوص ٹرین ہے۔ چاچا وضی بولے رستم جب مانوں گا جب اس ٹرین کے عہدے تک پہنچو۔ وہاں تک تو میں نہ پہنچ سکایں اگر آپ کے دلوں تک پہنچ گیا ہوں تو پھر سفیر ٹرین کی کیا حیثیت ہے۔

پہلے سال کے طالب علموں نے ایک دفعہ سارے کالج میں اسٹراٹیک کرادی تھی۔ ان دنوں لڑکے اس وجہ سے ہڑتال نہیں کرتے تھے کہ احتجاج ملت ہیں یا سرکاری یا پبلٹی نرم ہے۔ بلکہ ان دنوں ہم سیاسی آزادی مانگ رہے تھے۔ ہماری ساری عمر آزادی مانگتے مانگتے گزری اور شاید یہی حسرت لے کر ہم مر جائیں گے.....

..... میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ میں تو کتنے کوفتا کا ایک دفعہ پھر بخش خدا کی بیعت نے کسی سیاسی تحریک میں سارے کالج کو بے کردار کیا تھا اور پھر لڑکوں کا جلوس نکالا تھا مجھے پہلے ہی احساس تھا کہ محکمہ کوٹنے والا ہے اس لیے چھٹی کی درخواست بھیج دی کہ میں "مستحق" ہوں یعنی بیمار ہوں اور یہ مستحق کالغہ حضرت ابراہیم سے سیکھا تھا۔ چنانچہ کتابیں لے کر دُزر باغ چلا گیا کیونکہ بنیادی حافیت ملتی کی تھی۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ کم از کم پڑھے لکھے طبقے میں ایسے بھی سوچنے والے لوگ ہیں جو نازک موقعوں پر کتابیں لے کر دُزر باغ نہیں چلے جاتے کیونکہ جب وہ سوچتے ہیں تو ملک کی ترقی کے بارے میں سوچتے ہیں۔

اگر آپ نے "انوارِ کبلی" پڑھی ہو تو آپ کی مشکل حل ہو جائے گی کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ جب راجہ نے دُزر سے چھٹا کر اگر انجان ایک اہل زراعت سے سوال کرے اور اہل زراعت کو خود بھی جواب کا پتہ نہ ہو تو کیا کرتا چاہیے۔ اس نے کہا "مگر نہ شنیدہ دکایت گانا" کیا تم نے گانا کا قصہ نہیں سنا۔ گانا ایک دورِ افتادہ گاؤں کے جاہل لوگوں میں ایک ہی سیاق تھا جب بھی ان کو کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا تو کتبے چلو گام سے پوچھ آئیں۔ ایک زمانہ تھا کہ میں خود بھی کاتھالیٹک حکومت کا قانونی مشیر تھا جب بھی حکومت کسی مشکل میں ہوتی تو مجھ سے مشورہ طلب کیا جاتا تھا۔ مجھے چونکہ قانونی طور پر رائے دینی ہوتی تھی اس لیے کچھ خاموش رہتا تھا۔ اس لیے کہ مجھے خود کم علم ہوتا تھا۔ خصوصاً پرہس ایکٹ کے بارے میں مجھ سے سوال کیے جاتے اچھا ظرا میرے ایکٹ کی صاحب یہ فلاں اخبار بہت تنگ کر رہا ہے اس کا کیا تدارک کریں؟ میں کہتا۔

"حفاظت خدہ کر لیجئے۔" وہ پوچھتے کہ اگر اس نے ناگھکرت میں درخواست دے دی تو پھر؟ میں کہتا درخواست تو ضرور منظور ہوگی۔ وہ پوچھتے پھر کیا کریں! میں کہتا کہ پھر حفاظت خدہ نہ کیجئے۔ دیکھا کہی اچھی رائے دی۔ سانپ بھی نہ مرے اور لالچی بھی نے

ٹوٹے۔ بات جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں پہنچ گئی جیسے گھوڑا ہماگ دوڑ کے تھکا ہوا واپس آ جاتا ہے۔

میری قسمت میں یا تو کتنے سے اعزے ہیں یا گندمی ٹالیاں۔ ان گندمی ٹالیوں میں اگر کسی کا ایک پیڑ بھی کم ہو جائے تو وہ اس کے لیے بچپن سے لیکر ساتھ برسنے تک روٹتا ہے اور اس کو روٹا دیکھ کر ہم ہنستے ہیں۔ جب وہ ایک پیڑ سے بکھڑ یا وہ قیمت والی چیزوں مثلاً بنیادی حقوق کے لیے محض روٹنے کی جھل بناتا ہے تو ہم حارث ہوجاتے ہیں۔ اگر یہ حقوق واقعی بنیادی ہیں اور ان کو کھودینے میں کسی کو تامل نہیں ہے تو کیا ہم اپنی بنیادی نہیں کھود رہے۔

حسرات۔۔۔۔ زیادہ سے زیادہ غلطی یہی ہو سکتی ہے کہ حسرات کو حسرات پڑھا جائے یعنی حسرتوں کی جمع اور حسرتیں بھی میری جو جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں۔ کہیں ان غفلوں پر جو بن کھلے مر جھکا جاتے ہیں۔ مر جھکتے کیا ہیں جنہیں کھلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

ابنی تحریروں کے بارے میں

"حلقی الانسان علمہ الیان" خدا نے انسان کو پتہ کیا اور اس کو بیان کرنا سکھا یا تو آپ اگر اپنا رد و دل بیان نہ کر سکیں تو گویا اپنی پیدائش کا خشتچہ رانیں کرتے۔

میں نے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا کہ میں قوم کی اصلاح کے لیے کوئی مشن لے کر آیا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بات میں نے کسی خاص ارادے سے نہیں کی۔ تقریریں لکھتے وقت کوئی خاص مقصد میرے پیش نظر نہیں ہوا کرتا تاہم لکھتے لکھتے کوئی مقصد خود بخود نکلتی آتا تھا۔ اور کیونکہ ایک طرف مجھے اپنے ظلموں پر اور دوسری جانب آپ کے ظلموں پر اعتراض تھا۔ میں نے بلا تامل اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا۔ اس بات کا میں نے اس وقت بھی اعتراف کیا اور اب بھی کرتا ہوں کہ اگر وہ چاہتے تو اس چیز کو شے آپ مشعل کہتے ہیں آسانی سے بھانپ سکتے تھے۔

میں نے اکتوبر 1958ء کے ڈیز ہما کے اندر حکومت کو صلاح دی کہ ان کے ٹھیک مقاصد کے پیش نظر ان کے لیے ایسا طرز عمل مناسب نہیں جس سے لوگوں کے دل اپنے پریشان خیال کے بوجھ سے دب کر چلے جائیں۔ دوسری طرف آپ لوگوں کو میں چھوٹے چھوٹے قصے سناتا رہا۔ ہنسا اور ہنسا رہا۔ تاکہ حکومت کے عاملین کے ہاتھوں کہیں زیادتی بھی ہو جائے تو آپ کے دل نہ ہنسنے جائیں۔ آپ اسے ایک حارث بے آراء یا بھولیں اور آپ کے ذہن کی پچھلی ٹلائی سے بھی بڑھ کر غلامی میں پرورش نہ پا گئیں۔ اور آپ دیکھتے ہیں کہ ذہن بھری پر اگر زیادہ باز پڑے تو وہ پست خیالی میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور ایک قوم اس طرح نہیں بنی کہ اس میں جس قدر آدمی ذہین خیال ہوں اور اپنی ملک میں کہیں بھولنے خیالی پیدا ہوا تو اس کا گنا گناوت پڑ جائے۔

ایک دفعہ ایک بہادر فسر لڑائی میں مارا گیا جب اس کی لاش گرہ بچتی تو اس کی بیوی بھائے رونے کے لاش کی طرف گھورتی رہی۔ لوگوں نے یہ دیکھا تو سمجھے کہ اس کی سبکی حالت روحی وجہی امر جانے گی۔ کیونکہ غم میں رونے ایک فطری امر ہے۔ رونا رونے سے دل و دماغ پر دباؤ پڑتا ہے ایک سن رسیدہ عورت نے جب یہ دیکھا تو اس کے شیر غوار بچے کو اس کی گود میں ڈال دیا۔ بچے کو کچھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور بولی۔ "میرے مال! اب میں تیرے لیے جیوں گی۔" میں نے تو سبکی کیا کہ لوگوں کی گود میں امید کا کچھ ڈال دیا اور دلانے سے مراد یہ تھی کہ ایک غم ان کو نہ کھا جائے اور دوسرے اپنے ماضی کی بد معنائیں پر غور میں غم میں نیک لوگ کہا کرتے ہیں کہ جو غور سے پیارا ہے یا رونے کی صورت بتائے تو وہ داخل جنت ہو جاتا ہے۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان تین باتوں میں سے میں کون سی صورت کا ذمہ دار تھا۔ اور دوسرے لوگ کون سی بات کے۔ مگر تینوں صورتیں شائبہ کی قسم اور کم از کم آپ کے دل کی جنت میں تو داخل ہو گیا۔ میرے قرآن آپ نے جنت دانہ گندم کے بدلے اللہ تعالیٰ میرے روحانی باپ نے ایک سیاہ خال کے بدلے سر قند و بخارا بخش دیے۔ مگر اس چانچ سال رونے میں بھی بسر کروں تو کم ہیں۔ ویسے میں رو پاؤں کہ تانہ مجھے فحشی زیادہ آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں سے زیادہ منافقوں سے کہا ہے کہ تم بھی انکار کرو ہم بھی انکار کریں گے۔ میں کہتا ہوں کہ تم بھی ہمسواور ہم بھی نہیں گے۔ بس میرا دل ان دنوں یہی تھا کہ آپ کا دل بھلاؤں۔

جس زمانے میں میں شیخ بن تھا۔ ایک دفعہ ایک بڑے جہدے سے جو میرے لائق نہیں تھا یا شاید جس کے میں لائق نہیں تھا مجھے محرم رکھا گیا۔ والد محرم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی تکلیف آتی تو کہتے کہ اسی میں خیر ہوگی۔ اس میں جی نہیں انہوں نے کہا کہ اس میں خیر ہوگی۔ آپ تم شیخ بن کی حیثیت سے رہیں گے میں دس بارہ دن کو بات میں آ کر کام کرتے ہو مجارے پاس رہتے ہو میں بڑھاپے میں بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اگر تمہیں ترقی ملتی تو پھر ہم سے ملے کم آیا کرتے۔ میں نے مایوسی کے عالم میں تو ان کو کھو کر کہا آپ ایسا باتیں کرتے ہیں جیسے کوئی چھوٹے بچوں کو کہتا ہے۔ والد محرم نے نرم مسکراہٹ سے جس کی یاد سے میری فکر مٹھیں اور مضطرب انسانیت اپنی جگہ پر ادا ہو جاتی ہے نرے مایا تو میں یہ کہوں کہ اس میں خیر نہیں اور یہ جو تمہیں ترقی نہیں ملتی تو میں اس کا خیال کر کے اپنا دل دکھاتے رہو۔ میں بھی آپ سے یہی کہتا ہوں کہ یاد آدھ اچھا تھا جس میں نے کہا نہیں اس میں خیر تھی اور خزانہ کے بعد بہار آتی ہے یا یہ اچھا ہوتا کہ میں آپ کو آپ کے حال پر چھوڑ دیتا اور آپ کسی ایسے شخص کے ہاتھ پڑ جاتے جو آپ کو مایاں کرتا اور کہتا کہ اس میں کوئی خیر نہیں۔

بعض عنوانوں کو اس لیے مرثیہ کہتا ہوں کہ وہ اولاد آخرا کا پراپیٹا طوعا و کرہا جبراً و قہراً اقصیٰ کہتا رونے کے مضمون ہیں مثلاً

قوم کے نام خطاب یا دایام رفتہ اور زلزلہ کس کو ستاؤں کوئی ستی نہیں۔ عنوان کیا ہیں بول کا خاستان ہیں جہر بھی قدم رکھوں کا پتے چنے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا اسی جنگل میں تھوڑے دن ہوئے تھیں عامری لکھے پاؤں دوڑتا پکڑتا تھا۔ پاؤں سے کاٹنا کٹانے کے لیے دیشا تو بلی کا ناظر سے غائب ہو گیا۔

رقم کہ خار از پاکم حمل نہیں شد از نظر

یک لطف غافل بود و صد سالہ را ہم دور شد

کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں بھی تھیں عامری کی طرح..... میرا مطلب پاگل ہونے کا نہیں کاٹنا کٹانے کا ہے۔ مگر اتنی فرصت کہاں! آپ کو میرے پاؤں کے کانٹوں کے ساتھ ساتھ چلنا پڑے گا اور اگر کانٹوں سے بچنے کے لیے آپ نے ہوت بہان لے لیے تو میں خار پاکی بھائے خار ملو بن جاؤں گا جس کی تکلف سے آپ کا دل بھی محفوظ نہیں رہ سکے گا۔

ایک دفعہ ہم اقبال کے موقع پر چناپہ شورش کاشمیری نے لاہور کے شہریوں کی طرف سے مجھے "لسان پاکستان" کا خطاب دیا تھا اور بعض لوگوں نے اس خطاب کو اس طرح لکھنا شروع کیا جیسے "لسان پاکستان" ہو۔ ان کے خیال میں فرق صرف اتنا ہے کہ لسان کا "لام" لسان کے نون سے پہلے آتا ہے اور پھر "سن" لسان کے "شین" سے پہلے آتا ہے اور وہ محض ایک لسان ہے اور یہ چری زبان ہے۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا کہ فرق اتنا ہے کہ "اس میں دس ہے مجھ میں ہائے ہے"

لسان پاکستان کا خیال یوں پیدا ہوا کہ اکثر ادیب لوگ دانشور پر میری تقریروں سے غلام مطالب نکالتے ہیں۔ "میرے سادہ خیالات کو سمجھنے کے لیے نہ خیالات کو کٹانے کی ضرورت ہے نہ یہ جانے کہ جب میں تو شوش کوں تو آپ اس سے بوسے کا مطلب نکالیں۔ ویسے آپ کو بوسہ چاہیے تو کس نے روکا ہے۔ جو کچھ میں کہتا ہوں یہ ایک تسلسل خیالی کی بجوری ہے اور تسلسل خیال ایک نفسیاتی کیفیت ہے۔ جس میں خیالات امواج بکری طرح ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ موجیں آئیں مگر اتنی ہیں تو ان سے قننا میں نوٹ کر پھر ادبی طرح برتی ہیں۔ یہ ایک اور نفسیاتی کیفیت ہے جو آپ کی توجہ اور ہمدردی کی طالب ہے۔

تر ہے مرے آنسو سے گر بیان قننا

مجھ سا بھی نہ ہو کوئی پاشیان قننا

اردو کے بارے میں

حمید نقوی کا خیال تھا کہ میں اردو لکھ سکتا ہوں۔ لیکن کتنی دینی میں بھی لکھ سکتا ہوں مگر یہ بات یہ ہے کہ بہت دنوں تک میں

موٹ کا۔

میں نے پچھا کہ یہ اکاؤ کیا ہے؟۔ شیر بخاری صاحب کو بھی احساس تھا کہ یہ لفظ میری بساط سے باہر ہے۔ انہوں نے میرا ہاتھ تھام کر کہا کہ یہ انگریزی لفظ آئیڈی کی تقریب ہے۔ اب اگر تقریب کا لفظ اکاؤ سے کم نہیں ہوتا آپ مجھے جو چاہیں سزا دیں۔ تقریب سے مطلب عربی کا رنگ دینا ہے۔ مگر میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ یہ تقریب ہے یا تقریب۔ میں نے پھر ہاتھ اکاؤ سے لکھ کر کہا کہ اس پر بخاری صاحب نے دستور العمل کی ایک نقل دی جس کی دھڑک میں لکھا ہے کہ اردو زبان کے متعلقہ حقیق و فروغ و اشاعت کا نام ہے۔ اردو اکاؤ کا یہ دستور العمل پڑھ کر تو میں سر سے پاؤں تک معرب ہو گیا اور جسم سے عربی لپکتی گئی اور قرآن شریف بھی بھول گیا۔ اب ذرا سنے دفعہ نمبر-3

”اردو اکاؤ“ تاریخ و ثقافت زبان و ادب اور دیگر علوم و فنون کے فروغ و ارتقا کے لیے ترجمہ و تالیف اور تحقیق و تصنیف کے مختلف شعبے کا مجموعہ بن گئی۔ اردو کے معیاری کتب کے تراجم کا دوسری زبان میں بندوبست کر کے تاکہ بین الاقوامی افکار و معارف سے اردو زبان و ادب متعارف ہو سکیں۔ ”ان جملوں میں سے آپ حروف ہار اور“ کر کے گی“ کے الفاظ نکال دیں تو باقی جو رہ جائے گا وہ اردو اکاؤ ہوگی۔ دستور العمل دیکھ کر غالب کے مسطر کلام کو گھٹنے میں بہت مدھنچتی ہے بلکہ مجھے تو یہ معلوم ہو گیا کہ انہوں نے اپنے اس مشہور شعر میں اردو اکاؤ کے قیام کی تاریخ بھی لکھی۔

شمار ہو مرغوب بت مشکل پند آ
تلاش ہے یک کف بردن صد دل پند آ

بہادپور میں تو شیر بخاری نے صاف گوئی سے کہا تھا کہ یہ اردو اکاؤ ہے۔ مگر یہاں ملتان میں اردو کا لفظ کسی مصطلح سے استعمال نہیں کیا گیا۔ ایک تو آغا شہر احمد خاں قاری نے زیادہ تعلق رکھتے ہیں دوسرے اردو کے لفظ کے نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ اکاؤ کی کاروائی قاری میں لکھ دیں تو کی مقرر نہیں ہو سکتا۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ ”گزشتہ سال کی رپورٹ اردو اکاؤ کی اپنی زبان میں ہوتی تو اکاؤ کو ایک گونہ سرت حاصل ہوتی“ میں سوچتا ہوں کہ اکاؤ کی زبان کون سی ہے۔ ملتان تو نہیں۔ آغا شہر احمد خاں المعروف پرخوش جو پیش مقام پر اپنا نام راقم الحروف بھی لکھتے ہیں۔ اکاؤ کی رومک لکھتے ہوئے اردو زبان کا مرثیہ بھی لکھ دیتے ہیں۔ ہاں تو بات دور ہی تھی کہ اکاؤ کی اپنی زبان کونسی ہے اور خوش صاحب کیوں اس کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔ اسے میں میری نظر سے ان کی دور پڑت گزی جواںہوں نے نمبر ان اکاؤ کو 1955ء میں پیش کی تھی۔ ایک گھڑا کھد ہو۔

تیر کو تیر را چھا کے افسانے کا ہیرو بھگتا رہا۔ یہ تو اب تک آپ کو معلوم ہو ہی چکا ہو گا کہ مذکر اور موٹ کے سلسلے میں اس کا کھٹن کھٹن کر جاتا ہوں۔ جیسے لکھا تو اس وقت تک میں نے نہیں دیکھا تھا مگر ان کے نام سے میرا حوصلہ بڑھا اور ایک گونہ غیرت کا سوال بھی پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں اردو میں تقریر کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ویسے یہ بڑے جسارت کی بات تھی۔ پھر وہ تقریر میرے لکھاؤ نے اپنے اعتبار میں اس طرح بڑھا چڑھا کر کشائش کی اور پچھلے سے زبان کی لفظیں ابھی اس طرح ٹھیک کر دیں کہ میں ایک پائے کا ادب بلکہ ادب لطیف بن گیا اور لوگ اپنا کلام اصلاح کے لیے بھیجے گئے وہ سارا کلام میرے پاس رکھا ہے۔ جب میں اپنی اصلاح سے فارغ ہوا تو اس کی اصلاح کی طرف توجہ کروں گا۔

اب مجھے کچھ تعریف کرنی ہے کچھ اردو زبان کی زبیری صاحب کی کچھ اردو اکاؤ کی اور مثنوی ایک آدھ لفظ اگر اپنی تعریف میں منہ سے نکل جائے تو آخر میں بھی انسان ہوں۔ زمانے کا کاردار بھی اس طرح چلتا ہے اور اردو ادب کی خدمت بھی ساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہے۔ اس سے زیادہ کیا خدمت ہو سکتی ہے کہ پختاستان کا ایک بادشاہ ہر پاؤں اور محروم کو تھوڑی سی سے عبور کر کے ڈاکٹریٹ کارے ہاں کھانے کی پرواہ نہ کر کے چلستان کے قریب اردو اکاؤ کا افتتاح کرے۔ میرے تو خوشی سے آنسو نکلنے لگے کہ میں اتنی خدمت یا کم از کم اتنی قربانی کے قابل ہوں۔ اس اکاؤ کی حق میں مجھے ہر یاد آنے لگتا ہے جب وہ رانا سانگا سے لڑا تھا۔ مجھے وہ واقعہ یاد آ رہا ہے جب باہر سے شراب کے پیالے توڑ ڈالے تھے۔ میں بھی ایسی ہی محسوس کرتا ہوں۔ جیسے میں نے ساری پشتو فساد کی۔ پختاستان توڑ دیا ہو۔ خوشحال خاں خشک کو چھوڑ دیا ہو تاکہ اردو فروغ ہو۔ یہ بات تو مجھ میں آتی ہے کہ بعض دفعہ زبردست تعلیم اپنے لوگ بناتے جاتے ہیں جن کی علمی استعداد اذرا کم ہوتا کہ وہ اپنی لیاقت کو مد نظر رکھتے ہوئے دوسروں کی لیاقت بڑھانے کی کوشش کریں لیکن یہ بات مجھ میں نہیں آتی کہ اردو اکاؤ کی اس صدارت کے لیے آپ نے مجھے کیوں منتخب کیا ہے مگر اب جو آپ نے مجھے چنا ہے تو آگے لگے پختاستان کو۔

اس بزم میں کچھ ایسے بھی گئے جو کجاہ کی طرح صرف انگریزی پڑھتے رہے ہوں گے اور اردو فارسی سے ان کا سوتیلی ماں کا سلوک رہا ہو گا یعنی وہ جیسے سوتیلی ماں ہوں اور اردو سوتیلی بیٹا اور اگر اردو موٹ ہے تو سوتیلی بیٹی۔ یہ تو میں نہیں جانتا کہ اردو مذکر ہے یا موٹ۔ البتہ جانتا ہوں کہ اگر کسی پختان نے کہا کہ میں نے اردو سیکھا ہے تو اردو دان پختانی اس پر ہنسے گا اور کہے گا کہ اس کو ”اردو سیکھنا نہیں چاہیے“ سیکھنی چاہیے بلکہ ”سکھنی چاہی دے۔“ مگر آپ کچھ نہیں پختانوں کی اردو گرامر میں ایک ثابت قدی اور سادگی ہے ایک استعمال آئین اور قاعدہ کلیہ ہے وہ یہ کہ پختان مرد صرف مذکر کا صیغہ استعمال کرتا ہے اور پختان عورت صرف

امتیاز میں یہ لوگ سختی اور بے چلے گئے ہیں۔ یہاں بھی اپنی اصل پر نظر ہے، ورنہ کاف کا بل کی بجائے کاف بخش اور قاف قدر ماری بجائے قاف قسمت زیادہ موزوں ہوتا کیونکہ یہ بخش بخش جو ہم بل اور باخترا کی جانب سے اٹھتی ہوئی دیکھتے ہیں واقعی قسمت کی قسم ظریفی ہے۔ الغرض جب ہم صحت مند ہو جائیں گے تو اردو کی سادہ جاتی بڑھ جائے گی کہ گندھارا سنگھ بھی تحریری لہجے میں کہنے لگے گا "اردو یاں فوجاں آئیاں۔"

اسی طرح خودی کا لفظ لیجئے جب اردو بولنے والے مستقل مزاج ہو جائیں گے تو دنیا والے خودی کے لفظ کو سن کر یہ اعتراض نہیں کریں گے کہ یہ تو معروف ہے نہ ناہول بلکہ یہ کینس کے کہ خودی میں جو خود داری ہو شیدہ وہ خودی کے واؤ کے برعکس سننے میں آتی ہے دیکھنے میں نہیں آتی مگر اس وقت تو آپ کی صحت بگڑنا زیادہ اچھی نہیں ہے اس وقت آپ نے پورا رام لفظ بولنے کا کفر کیا تو اس کی حیثیت ایک شرف خیزی کی سی ہوگی۔" لیجئے میں فحش کرتا ہوں تاکہ آپ زیادہ ناراض نہ ہوں۔ مگر آپ کو یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ میں اردو کی خدمت کر رہا ہوں۔ ورنہ جانے آپ اس کو کتنی غیر فحش باتوں کے سینگ لگا سکیں گے۔ یہ تو پہلی بار یہ سینگ ہے۔

سیاست کے بارے میں

مجھے نہ سیاست سے کام ہے نہ سیاست کو سمجھتا ہوں۔ البتہ اس بات کو بہت اہمیت دیتا ہوں کہ لوگ بڑول نہ ہو جائیں اور ان کے حوصلے پست نہ ہوں اور ان کے خیالات دب کر ان کے چند باسانیت کو بھردار نہ کر دیں۔

مگر اسے اصحاب کف یا دوروہ دن جو 23 مارچ کا قیام سن چائیں (40ء) میں اس شہر لاہور میں قہر نے مسلم لیگ بنا کر قاضی عظیم کی سرپرستی میں پاکستان ریزولوشن پاس کیا تھا۔ اس سے پہلے "لوہنکین ہینا مذکورہ" کی حیثیت رکھتے تھے یعنی قبیلہ قاضی ذکر چیز نہیں تھے۔ اس سے پہلے پاکستان محض ایک خیال تھا اور جب اس قرار داد کی رو سے یہ طے ہوا کہ اب مسلمان کا مطیع نظر اچھے لیے ایک علیحدہ مملکت پیدا کرنا ہو گا تو اس کی تائید کرنے والے قیام پاکستان کو ایک کھلا امکان ہی بدیہی سمجھے تھے۔ یہی خیال تھا کہ اگر ہم علیحدہ ہونے کی دھمکی دیں تو شاید ہمیں مشرق کے ہندوستان میں زیادہ حقوق مل سکیں۔ میں خود تو وہاں موجود نہ تھا۔ اس لیے اس بات کی ذمہ داری راوی پر ہے جو اس صورت میں راجہ حفیظ علی خاں غاں اور جود بایے راوی کی طرح رواں تھے بنا کر تے ہیں۔ ان کی روایت ہے کہ اصل قرار داد سر سکندر حیات کی تھی اور وہ یہ تھی کہ ہندوستان کے اندر دو صوبے مسلمانوں کے ہوں گے جو امور خارجہ اور دفاع کی حد تک دوسرے صوبوں کے ساتھ اشتراک کریں گے۔ مگر قاضی عظیم نے اس میں دو لفظ تبدیل کر دیے۔ جس سے قرار داد کا چہرہ بدل گیا۔ چہرے پر تو صرف دو خیال لگے گئے ایک پنجاب کی کشادہ پیشانی پر دوسرا بنگال کے چاند خنداں پر منکر

"علم و ادب اور فن کے لیے صحیح ذوق اور فکری ترویج اور تربیت اردو زبان کے علمی اور ادبی ذخائر میں عصر حاضر کے صحت مند تقاضوں کے مطابق منبع افکار کا اضافہ ہوا اور شعر و ادب کے لیے پاکیزہ ذوق کی اشاعت اور علم و ادب فن کے ذریعے مملکت اور معاشرہ کو نئے ذوق خدمت کی پرورش یہ تھے وہ مزاحم جو ممان اکاؤنٹی نے اپنے لیے قبول کئے۔"

آپ کو معلوم ہو گا کہ کاف کے "کی حروف چار ہیں اور خوش صاحب کے اس مختصر سے کام میں جو میں نے ابھی پڑھا ہے کیا وہ مقام پر استعمال ہوئے ہیں۔ خوشا حروف چار اگر یہ ممان میں نہ ہوتے تو ہم کیسے پتہ لگا سکتے کہ خوش صاحب اردو بول رہے ہیں یا فارسی۔

سجاد صاحب مجھ ہی جانتے ہیں کہ حالات حاضرہ کا ایک کٹھا ضامیری قضا تک پہنچی کیا ہے۔ "قضاے" کے لفظ پر مجھے محترمہ پر "چراغ راہ" کا وہ سوال یاد آیا جو انہوں نے ازراہ استفسار نہیں بلکہ ازراہ زینت ارسال کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ "کیا اردو زبان کا موجودہ رسم الخط کسی جدید خطی کا مستحق ہے؟ میں نے جواب دیا اس کی نقل تو میرے پاس نہیں ہے مگر وہ کچھ اس طرح پر تھا کہ اردو رسم الخط نے خود کو کوئی قضا نہیں کیا کہ مجھے بدلا جائے مگر آپ کی سبب رضا ہے تو پھر اردو کی قضا ہے البتہ انسان کی فطرت اس بات کی تقاضی ہوتی ہے کہ چیزیں ہمیشہ بدلتی رہیں کوئی اس کو کچھ نہ کہتا ہے کوئی بدعت اور کوئی تو انقلاب کے در سے بے تک پہنچا دیتا ہے اب چونکہ آپ کو اور کوئی جدید خطی نہیں سمجھتی اور شاید یہاں بھی چار سے یک لخت ایک ہونے پر آپ "کل مدید لفظ" کی لذت سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس لیے عرض اردو کو شریک حیات سمجھ کر اپنے بعض میلانوں کی تسکین کے لیے اس کو روکنے کا فرما کر فرما دیتے ہیں۔

میرے خیال میں محترمہ پر وہ پھر غرضیہ اندھ کو مستحاضی کی بجائے قحطل کا لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ کیا اردو رسم الخط بھی اتنی جدید خطی برداشت کر سکتا ہے کہ اسے رومن کا جامہ پہنا جائے مگر ہمارے کی تحقیر یہاں غلط ہے۔ اس کا تو چہرہ ہی بدل جائے گا یہ بھی محض لباس کا بدلنا نہیں ہے۔ رسم الخط کو تو زبان سے وہ تعلق ہے جو جن کو جان سے ہے۔ میں نے فراق کا ذکر اس لیے کیا تھا کہ یہ اہل مغرب کا مخصوص لباس ہے اور غالباً اردو کو رومن بنانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اسے مغرب کے لیے دلپذیر بنا دیا جائے۔ مگر آپ بھول رہے ہیں کہ کسی زبان کی اہمیت اس کی اپنی خوبصورتی سے نہیں بدلتی بلکہ اس کے بولنے والوں کی خوبصورتی سے بدلتی ہے۔ جب آپ اصطلاحی طور پر صحت مند ہو جائیں گے تو آپ کی قومیت کا اعتبار قائم ہو جائے گا۔ اور دنیا آپ کی اردو بھی سمجھنے کی اور اس کے رسم الخط کے لکھنے بھی اٹھائے گی۔ کاف کا بل اور قاف قدر ہمارے بار یک فرقی کو دیکھ کر لوگ کہیں گے۔ سہاں اللہ انھیں حروف کے

جو بھی اٹھا بیس دن کا ہوتا ہے کبھی آٹیس دن کا۔ اور یہ محض ایک روایت ہے کہ کسی زمانے میں بیس دن کا بھی ہوا کرتا تھا۔ تو سوال دن اب موم بادلوں میں چھپا رہتا ہے۔ اب یہ پانچ سال اور پانچ مہینے کا تیسرا وقت نومبر یا دسمبر 1967ء میں آئے گا۔ فلیک تاریخ کا معین کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ ایک تو جس بچہ کو رویت ہال کہتے ہیں وہ بیس سالن راتی ہے۔ دوسرے اس بات کا پتہ نہیں کہ اصحاب کہف اس کے بیسویں سال مٹا دیں گے یا پھر نہیں۔

قائد اعظم سوسائٹی کے اقتدار کا دور دیکر کامین بھڑو کا سا کہ جنم دن کی روایت پر قرار رکھنے کے لیے کوئی اور ہنگامہ ضرور ہو۔ اب تو صرف خیرات ہی کرتے ہیں۔ شاید اس خیال سے کہ مہاراجا کا اعظم دوسری مرتبہ پیدا ہوں اور اصحاب کہف کو اپنی پہلی نیند سے جگا نہیں یا اس شکرے میں کہ ان کی وفات فلیک وقت پر ہوئی ورنہ بیس میں پوری طرح جگا کر ہی چھوڑتے اور ہماری نیند خراب کرتے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ کم جاگیں۔ کیا ہم ہی جانتے رہیں اور لوگ جانتے کے لیے قہقہے لگتے ہیں۔

اس پر سب متفق ہیں کہ جمہوریت لا قانونیت کے منافی ہے۔ اس پر بھی سب متفق ہیں کہ جمہوریت دنیا کی ایک روحانی غذا ہے۔ اگر کسی ضرورت کے تحت صاحبان اقتدار ایک عرصے کے لیے جمہوری نظام کو معطل کر دیں تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ قحط کے دن تعطیلات کے دنوں کی طرح خوش گوار ہوتے ہیں۔ اب نہ وہ متفق ہیں کہ ریشہ پشاور کی گھولوں میں دو شفی۔ مگر پھر بھی ہر دور میں یہ کوشش راتی کہندے انڈوں کو الگ کر کے لیڈ کر دیا جائے۔ اور اب یہ لیڈ وایک قسم کا سرد خاندان بن گیا ہے جس میں شگرتے نالے اور آلو کے علاوہ گندے انڈے بھی رکھے جاتے ہیں۔

چنانچہ اب ایسا نظر آتا ہے کہ یہ گندے انڈے یا جن کو آپ نے گندھا تھا۔ لیڈو کے سرد خانے میں روک جیج و سالم ہو گئے ہیں اور اس لیے آپ یا تو "مارچا زائیں تھ" کہہ کر جب انڈوں کو گندھا کہا جائے تو کہیں کہ کیا مضائقہ ہے اور جب انڈوں کو اچھا کہا جائے تب بھی کہیں کہ کیا مضائقہ ہے اور یہ صورت آرا می ہے کیونکہ آپ کو سوچنا نہیں پڑتا یا پھر اگر فطرت نے آپ کو سونے کی نعمت میں جگا کیا ہے تو ایک ذہنی اختصار کے عالم میں آپ اپنے ضمیر سے چمچیں کر کیا جیج یا انڈے گندے تھے یا ساست میں انڈے گندے ہی ہوا کرتے ہیں۔

مجھے احتجاجات کے زمانے کا ایک قصہ یاد آ گیا۔ دوٹ ایک امیدوار کے ساتھ زیادہ تھے مگر سرکار دوسرے امیدوار کے ساتھ زیادہ تھی اور اس کے حق میں حکم خلاف فرضی ووٹ ڈالے جا رہے تھے۔ انتخاب کی گمرانی ایک تحصیلدار کا ہوا۔ آزدرو امیدوار نے اس دھاندلی پر شکایت کی۔ تحصیلدار نے کہا کہ ڈپٹی کمشنر کے پاس شکایت کرو۔ امیدوار نے جواب دیا وہاں بھی شکایت کر چکا

اس میں اتنی کشیدہ آہوئی کہ وہ دوسرے آزادی کے طالب ہوئے۔

ایک شاعر جس کا نام خواجہ حافظ تھا اور اس نے خال ہندو کے بدلے سرحد و بخارا لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔

"بخال ہندو شل عظیم سرحد و بخارا"

شرط صرف اتنی تھی کہ کوئی ہمارے دل کو ہاتھ میں لے "بدست آور دل مارا" یعنی بدست سے رام کرے۔ لوگ سمجھ کر یہ محض متعلق ہمازی کی کارگزاری سے گمراہ نہ تھے۔ سنار "دل بدست آور کج اکبر است"۔ اس لیے دل کا ہاتھ میں لے لینا کوئی جبری کیفیت نہیں بلکہ ایک لسانی معرکہ ہے۔ مگر حافظ ہر بات کو اپنے رنگی طرز میں پیش کرتا ہے اور بدخواہوں نے جوور کے پاس جا کر اس کی جھلی کھائی کہ دیکھئے حضور! آپ نے تو اتنی محنت سے سرحد و بخارا فتح کیے اور یہ شخص ایک سیاہ خال کے بدلے انہیں مفت بخش رہا ہے۔ جوور نے جارش ہو کر حافظ کو بلایا اور اس سے جواب طلب کیا کہ تم کیوں ایسی غفیش کرتے ہو اس نے جواب دیا کہ میں ملکہ اٹھیاں تو ہیں جنہوں نے مجھے اس حال تک پہنچا دیا ہے۔ بادشاہ افغان آمدید اور وہ سمجھا کہ میری حالت حافظ سے بہتر ہے مگر حافظ اصل بات تو اسے بتا نہیں جانتا تھا۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ ایک خال ہندو کے بدلے دوسرے بل سکتے ہیں چنانچہ اس شعر کی تعبیر 23 مارچ 1940ء کو ہوئی مگر احتیاد کا پہلو مد نظر رکھتے ہوئے پاکستان ریزولوشن کے ہندی چہرے پر ایک کی بجائے دو خال لگائے گئے یہ خال کیا گئے گویا چار پانچ لگ گئے۔

اسی طرح مردوں نے اپنے نام کا زہری بدل دیا ہے اور زیر و زبر ہو کر مردوں کی طرح پڑے رہے۔ اب تک ان کو سوتے ہوئے چودہ سال اور سات مہینے ہوئے ہیں (1947ء سے آج تک) کو بھی کبھی ایک آنکھ کھول کر پڑے پڑے حالات کا جائزہ لے لیتے ہیں اور پھر یہ کہہ کر کم تو اصحاب کہف ہیں اور ابھی ہماری نیند کی میعاد نہیں گزری۔ دو ایک آنکھ بھی بند کر لیتے ہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ آنکھ کھولے کب ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت کے بعد جیسے کوئی باقاعدہ تھکنی ہوتا ہے۔ پانچ سال اور پانچ مہینے کے باقاعدہ وقفوں کے بعد ہمیں نے دو دفعہ آنکھ کھولی مگر.....

"چشم واکر و دھجائے دگر سے پیدا شد"

آنکھ کھولی تو ایک نیا عالم تھا یعنی مارشل لا تھا۔ ان کی ترغیبی آنکھیں دو حالات پیدا کر رہی تھیں کہ جن کو ملک یعنی برے اور بھلے بانی پر انداز میں رک جائے تو انکشاف کس لہجہ پر نہیں رہتا یعنی رات ہی رات رہ جاتی ہے اور دل و دماغ "آئینہ و قانون سب کچھ معطل ہو جاتا ہے۔ باقاعدہ پانچ سال اور پانچ ماہ کے بعد اگر کبھی چہ مہینے ہو گئے ہوں تو میرا قصور نہیں۔ باور مضامین کا قصور ہے

ہے ایسے پتھر بھی تو تراشے جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ ہمارے لوگ اسے اچھے ہیں۔ سارا سال پھولوں کے ہار تیار رکھتے ہیں۔ اور باقی ترقی مذہب و ملت باقی ترقی رنگ و بو باقی ترقی دل و دماغ ہر ایک کو پہناتے ہیں اور اس کے لیے صرف ایک ہی شرط ہے وہ یہ کہ پھول پہننے والا کسی اچھے عہدے پر فائز ہو..... جو باتیں آپ کے نزدیک ارشادات ہیں وہ دراصل میری آرزو ہیں نہ کسی کی۔ میری پہلی آرزو یہ ہے کہ اپنے بچوں سے کہوں جیتا ہوا تم پہناتے کے ماحول میں پیدا ہوئے ہم نے تو اپنے آپ کا اچھا دو کو بیجا ہار پہناتے دیکھا میں تو عادت ہو گئی ہے۔ مگر خدا کے لیے تم ہاروں سے دور رہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کسی کی قدر نہ کریں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ آپ کسی کی دھوکہ نہ دیں۔ یہ آپ کے بڑے افسر، امیر، رُوزِ رِعمو، اچھے لوگ ہوتے ہیں مگر جن و شام جھوٹ سن سن کر ان کی طبیعت کا سازا ہو جاتی ہے۔ جھوٹ کا ماحول مطلوب آپ کو ایسی طرح ہے جس سے کوتاہ فہمی کی شکایت لاحق ہو جاتی ہے۔

گداگری بھی تو جاری سرشت میں ہے۔ گداگری بھی تارکما نا تکتا ہے اور ہم بھی تار چڑیں مانتے ہیں۔ جو صحت کے بغیر حاصل ہوں۔ خدا نے انسان کو بہترین فطرت دے کر پیدا کیا تھا ایک ایسی فطرت دے کر جو سچے کھنے پر مائل ہے۔ بھر پور دے کر پست کر دیا اور وہ بچک مائل ہے۔ کبھی اکیسے فقیر کی صورت میں کبھی قوی حیثیت میں دوسری قوموں سے۔ اقبال نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ خیرات مانگتے والے بھی فقیر ہوتے ہیں۔ "کوئی مانے یا نہ مانے میرے سلطان سب گدا"

اے اصحاب کلمہ! اچھے اب تک یہ معلوم نہ ہو کہ آپ کی کل تعداد کتنی ہے بعض کہتے ہیں کہ آپ تین ہیں اور چوتھا آپ کا سکا ہے بعض کہتے ہیں کہ آپ پانچ ہیں اور چھٹا آپ کا سکا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ آپ سات ہیں اور آٹھواں آپ کا سکا ہے۔ اللہ یہ بہتر جانتا ہے۔ مگر کن برحالت میں آپ کے ساتھ ہے اور اگرچہ کتا ایک وقار جانتا ہے اور آپ کو ان بنیادی اصولوں سے جو خدا نے آپ کی پیدائش کے ساتھ تحقیق کئے تھے وقار کی تسکنا ہے۔ وہ کبھی کبھی ڈانڈا بھی ہوتا ہے اور کتا بھی ہے۔ ایک شخص کو ڈانڈے کتنے سے کتا۔ ڈانڈے کتنے کہا کہ میں انجکشن تو لگا دیتا ہوں مگر پھر بھی آپ پر ڈانڈے پین کا اثر ہوتا ہے کتا کتا ہے اور یہ بھی اندیشہ ہے کہ نوبت آپ کے وصال تک پہنچ جائے گی۔ بہر حال میں شام کو پھر آؤں گا۔ شام کو کیا تو دیکھا کہ وہ شخص زور شور سے کانڈ پر کچھ کھ رہا ہے۔ ڈاکٹر کچھ کا وصیت کھ رہے خوش ہو کر کہا آپ بڑے بھوادار انسان ہیں۔ یہ اچھا ہے کہ آپ مرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس نے کہا "کیا بالے کتنے سے کتا ہے کہ وصیت کھوں۔ میں تو ان لوگوں کی قبرست بنا رہا ہوں جنہیں ہلاک ہو کر میں خود کھاؤں گا۔"

ہوں مگر کچھ نہیں بٹا۔ تحصیلدار نے کہا چیف مشنر کے پاس شکایت کرو امیدوار نے کہا ہاں بھی شکایت کر چکا ہوں مگر کچھ نہیں بٹا۔ تحصیلدار نے کہا تو کیا اسے لوگوں میں ایک میں ہی آپ کو بد نامت دار نظر آتا ہوں؟ میں نے آخر کیا قصور کیا ہے؟ اور میں نے کیا قصور کیا ہے؟

معاشرے کے بارے میں

معلوم نہیں مٹان اکاوی گانے کو جاکر کبھی ہے یا نہیں۔ پاکستان آرٹس کونسل میں تو ہم گانا بھی جاکر کھتے ہیں اور بھانڈا بھی۔ تیسری چیز یعنی باغ کو بھی جو ان دونوں سے بہتر ہے۔ بہت سی چیزیں کو آپ مکان و زمان کے اعتبار سے جاکر بنا دیتے ہیں۔ مثلاً اگر گچھنے اور گانے کو مٹا کر قس و مرد کہ جائے اور اس کا افتتاح کسی مستحق آدمی سے کر دیا جائے اور وہ بازار کے بالا خانے کے بھائے کسی لنگھ میں ہوتا ہے اسے آرتس کہتے ہیں اور اس کا شمار نون لطیف میں کیا جاتا ہے۔

ایک دفعہ ایک سرکاری ملازم کے خلاف یہ جرم قائم ہوا کہ اس نے ایک گانے والی عورت کو کچھ زمین دلائی تھی۔ اس نے اپنی صفائی میں یہ کہا کہ وہ آرتس ہے۔ جس زمین کی خرید و فروخت پر یہ تازہ پید ہوا تھا اسے بھلا کر بھٹ اس بات پر شروع ہو گئی کہ خریدنے والی آرتس ہے یا نہیں گانے والی۔ چونکہ سرکار کا پلہ ہماری تھا۔ وہ آرتس گانے والی ہی رہی۔ مگر کیا کوئی گانے والی قیمت دے کر بھی زمین نہیں خرید سکتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ وہ بھاری آسان سے بھی محروم رہے اور زمین سے بھی۔

آج کل یادگاروں کے دن ہیں۔ سنا ہے اب پاکستان کی یادگار بننے کو بے جیسے آپ خود کو یادگار ہوں۔ جیسے آپ کی کاروباری دیانت داری جائے خود ایک یادگار نہ ہو۔ مگر سنا ہے کہ آپ مجسوم سے گھبراہٹے ہیں کیونکہ بت پرستی دین احمد میں کبھی نہیں آئی۔ جہاں بت دیکھا آپ نے تو ڈالا خواہ لڑیں جب تک دلی شخص کا ہی کیوں نہ ہو۔

میں مجسوم کا ذکر کر رہا تھا اور یہ کہ بت پرستی حرام ہے اور بت شکنی حلال۔ البتہ اتنی فراخ دلی ہم میں ضرور ہے کہ یہ حلال و حرام کا سلسلہ صرف پتھر کے جوں تک محدود کر دیتے ہیں۔ باقی ہمارے بت بھی ہیں اور بت خانے بھی اور ان کی وجہ پر ابھی تک کسی اہل شریعے نے اعتراض نہیں کیا۔ بشرطیکہ اس پر اللہ کا نام نہ چلایا جائے۔ "کچھ کہہ دوں اسے برہمن گرتو برہنہ مائے"

اے برہمنو! اگر برہنہ نا تو مجھے آپ پر شک ہے۔ کیونکہ جن مردوں کی آپ پر تشکی کرتے ہیں وہ تو پتھر کی طرح سخت ہیں۔ ان کے کل کیسے کل کتنے ہیں اور ایسا نسبت سے آپ کے نظریے بھی سخت ہیں یعنی فحش اور جلد جسم کے جن میں لپک نہیں ہوتی اور ان کے کل نظریں تو وہ دھوٹ جاتے ہیں۔ بدل نہیں کتنے۔ اگر آپ اپنے نظروں میں بحث اور اصلاح کی خواہش رکھیں تو کیا مضائقہ

۔۔ اس نے کہا یہ ایک کیڑا ہے جو پتے بھی کھاتا ہے اور بھاگ جاتا ہے..... میں نے پوچھا آغراس کا علاج کیا ہے؟ کہا علاج ایک قسم کا زہر ہوتا ہے جو درختوں پر چڑھا جاتا ہے اور جسے کھا کر کیڑے مر جاتے ہیں مگر اب تو یہ بھی ضروری نہیں ہے اس لیے کہ مقررہ کیڑوں کا موسم گزر جانے کا اور ایسے لیے شاعر نے اس عیار کیڑے کی طرف سے کہا ہے۔ ”چارو گر ہم نہیں ہونے کے جو دریاں ہوگا“

اور اسے اہل بصیرت دیکھو کہ موسم کے رد و بدل میں تمہارے لیے نشانیاں ہیں۔ آنکھ دو سال بھر پتے نہیں گے اور پھر کیڑے جوں کو کھائیں گے اور درختوں پر زہر چھڑکنے سے پہلے پھر کیڑوں کا موسم گزر جائے گا۔ لیکن زراعت کا کھلے ایسے طرح برقرار رہے گا۔

تعمیرات

کتاہوں کی لٹائش میں جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں ایک اردو دانشور نے نظر سے گزری میں نے کھول کر دیکھی تو پی ڈیوڈی کا لفظ سامنے آیا۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ پی ڈیوڈی سے کیا مراد ہے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ یعنی تعمیر و تخریب کا محکمہ۔ بریکنگ میں کھسا تھا موٹو یعنی پی ڈیوڈی کا لفظ موٹو کے صیغے میں استعمال ہوتا ہے۔ میں نے کہا چلو خبر ہوئی کہ یہ کھلا بھی موٹو ہے اگر ذکر ہوتا تو یہ لوگ نہ جانے کیا کر گزرتے۔

انتظامیہ کے بارے میں

کبھی کبھی لوگ یہ الزام لگاتے ہیں کہ میں ہر دفعہ بڑھتا جاتا ہوں۔ لوگوں سے میرا مطلب آپ لوگ نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جن کو آگرہ دی وی آئی ”ہالوگ“ کہتے ہیں۔ آپ بھی ان کو ”ہالوگ“ ہی کہیں کیونکہ ہالوگوں کی تربیت کا ایک ضروری حصہ گدھے کی سواری ہے۔ ان کو یہ تربیت اس لیے دی جاتی ہے کہ آنکھ زنگی میں وہ ہر ایک کو گدھا سمجھ کر اس پر سوار ہو جائیں کریں۔ میں نے تو گدھے کی سواری اس دن سے چھوڑ دی جب سہال کی عمر میں میرے ایک ہم عمر نے مجھے گدھے پر بٹھا کر اسے چھڑی لگا دی۔ میں فوراً گر گیا اور میری ناک پھول گئی اور ہوسکتا ہے کہ ابھی تک پھولی ہوئی ہو لیکن اس سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ ایک تو یہ کہ میں ”ہالوگ“ کی طرح کسی کو گدھا سمجھ کر اس پر سوار نہیں ہو جاتا۔ دوسرے یہ کہ میرے خیالات کا گدھا بن صرف اس کا تکبہ ہوا۔ اور ”ہالوگوں“ کا تو سر تک چڑھ جاتا ہے۔

حالیات

کسی نے مجھ سے ایک دن پوچھا کہ یہ سرکار کون ہے؟ میں نے پہلے اس کو سمجھا یا کہ فائس ڈیپارٹمنٹ کیا ہوتا ہے اور بجٹ کیسے بنتا ہے یعنی جس حد تک میں خود فائس ڈیپارٹمنٹ اور بجٹ کو سمجھتا تھا پہلے میرا خیال تھا کہ ایک فائس شطر ہوتا ہے اور ایک فائس ٹیکسٹری اور جب وہ دونوں کی مالی مطالعے کے متعلق لکھتے ہیں کہ فائس ڈیپارٹمنٹ اتفاق نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ حضرات انگریز نہیں کرتے۔ مگر اب میری کچھ بڑھ گئی ہے۔ فائس ڈیپارٹمنٹ ایک بڑا کلمہ ہے جس میں مذکور ہوا دو صاحبان کے علاوہ اسسٹنٹ بھی ہوتے ہیں۔ اب نیکشن افسر کی آگئی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک لکھتا ہے کہ اگر ہائیڈرو گرافنگ کا ہرجا اتنا کام کروے جتنا سب نے فل کر 1958ء میں کیا تھا تو چار یا بیٹھیں ہنگوں کی بجائے تین کافی ہوں گے اور باغیر میں یہ کہ میں انگریز نہیں کرتا چاہیے۔ اس پر اطلاع آتی ہے کہ فائس ڈیپارٹمنٹ انگریز نہیں کرتا بلکہ انگریز صرف ایف ڈی لکھ دیتے ہیں۔

جنگلات

اب مجھے عام اور مختصراً یاد آیا۔ ہم ہر سال سنتے ہیں کہ پاکستان کا صرف وہ فیصد یا دو اعشاریہ ایک منظر ایک (2،1001) فی صد درخت زبرد جنگلات ہے جو کم از کم پندرہ فی صد تو ہونا چاہیے۔ پھر سنتے ہیں کہ اس سال 6 اگست کو دس لاکھ ہجڑا چار سو اسی (10,72,479) درخت کاٹتے ہوئے اور پندرہ فروری کو چار سو اسی (479) کی بجائے چار سو اسی (480) کاٹتے ہوئے۔ وہ ایک قاتل درخت میں سے کاٹتے کیا تھا اور جہاں تک میں اسے ہال سے نظر آ رہا ہے۔ صرف وہی ایک درخت اس وقت کھڑا ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ باوجود اتنی کاٹت کے جنگلات کا درجہ 1950ء سے اب تک دو اعشاریہ ایک منظر ایک ہی کیوں چلا آ رہا ہے؟

کبھی سرکار نے پوچھا کہ یہ چار ہزار درخت یہاں اور آٹھ ہزار وہاں اور دس لاکھ سارے صوبے میں 1958ء میں لگے تھے ان میں سے کتنے چارے باقی رہ گئے ہیں؟ اگر سرکار کا پرائیویٹ باغ ہوتا تو ایک درخت کے سونے پر مالی کی جان پر نہیں جاتی۔ لیکن سرکار موٹو ہونے کے سبب جان نواز ہوتی ہے ”کم از کم مالی کی حد تک“ ”چپ کا کپا کیم۔“

زراعت

انگریز پکڑ سیٹلٹ آیا..... میں نے جی کے درخت دکھائے جن کے پتے کسی کیڑے نے کھالے تھے مگر کیڑا انعام تھا۔

عدالت عالیہ کہتے ہیں اگر کبھی ایسی کوشش میں نہ کی..... مگر خیران کوششوں کا ذکر چھوڑتے ہم تو ابھی تک عدل و انصاف کی چمک ڈھیلوں پر چل رہے ہیں۔ شاہراہیں تو ملی ہی نہیں۔ شاہراہوں تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اور ہم مل کر کوشش کریں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں دیانت سے کام کریں۔

ہمارے سچ صاحبان اور دکھ و صاحبان قانون میں بہہ جاتے ہیں اور قانون کا اصل مقصد نہیں دیکھتے کہ عدل تو ازان ہے۔ انصاف آپ زندگی کے عام معاملوں میں بھی عدل تو ازان پیدا کریں اور ایک طرف نہ بہہ جایا کریں۔

اس سال جنس سہارے پر سے میں بریکٹ بہت بڑھ گئے ہیں۔ ایک سال بائی کورٹ میں رہ کر انہوں نے شاید محسوس کر لیا ہے کہ ساری جوڈیشری بریکٹوں میں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم اس لیے بریکٹوں میں ہیں کہ بریکٹوں کے باہر کی آلائشوں سے پاک رہیں۔ آپ کہتے ہیں (میں میں آپ سے کہوں تو آپ اپنے کو بریکٹوں میں ڈال دیا کریں جس کا مدعا یہ ہوگا کہ حاضرین کے سوا باقی سب اس لیے بریکٹوں میں ہیں کہ ہم کو بریکٹوں میں بند کر دیا گیا ہے۔ شاید ترقیوں نے عدل و انصاف کے تصور کی تشکیل اسی طرح کی ہے کہ اس کا مجسمہ یا تو ایک آگھ کے ساتھ بنایا ہے یا بغیر آگھ کے۔ ایک آگھ سے مراد یہ ہے کہ سب کو ایک آگھ سے دیکھا جائے اور اندھا ہونے کا یہ مطلب ہے کہ انصاف کی ترازو قائم ظاہرین کے فریب سے متاثر نہیں ہوتی۔ انصاف کا مجسمہ چٹائی سے تو عزم ہوتا ہے لیکن کوپانی سے عزم نہیں ہوتا۔ یہ بھی دیکھنے میں نہیں آیا کہ اس کے ہونٹوں پر صبر یا دودھ ملے ہوئے ہوں۔ میرے خیال میں ایسے لوگ مجھے کا لفظ نہیں سمجھتے وہ اس سے کہتے ہیں اور بت تو جب ہی دہکتے ہیں کہ جب صنم بن کے آئے۔ وہ نہ جب لوگ کہتے ہیں کہ بت کی طرح کیوں کھڑے ہو تو ان کے کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آخروں میں زبان رکھتے ہوؤں میں تحریک رکھتے ہوؤں میں بھوکھتے ہوؤں تو منہ سے بولا۔ اب یہ تو صاف بات ہے کہ اگر مجھے یہ اختیار دیا جائے کہ میں آپ کے دلوں میں بہت بن کے آؤں یا صنم تو میں صنم بن کے آتا ہوں کہ ان کا گوارا اسی طرح آپ کا شکر یہ بھی ادا کر سکتا ہوں۔

جو دل میں ہے آنا صنم بن کے آ
خدا بن کے آنے سے کیا فائدہ

معاصرین کے بارے میں

سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور پھر کئی صدیاں چھوڑ کر اقبال اور علامہ اقبال پر لکھنا ضروری ہے۔

قائد اعظم..... 1946ء کی گرمیوں میں میں شملہ گیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پاکستان بننے سے پہلے کا وہ زمانہ کس طرح

جب سے ”بابا لوگ“ نے ”انسان“ کا لفظ سنا ہے وہ کچھ تحریر اور کچھ بے احتیائی کے ساتھ اپنے کلموں کو ایک ایسی انگریزی جنش دیتے ہیں۔ گویا یہ کہہ رہے ہوں۔ ”زبان یا زمین ترکی و من ترکی نمی دایم“

خدا کرے کہ میری زبان ترکی ہی رہے کیونکہ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ترکی پر ترکی کا اتحاد و ملا وجہ استعمال نہیں ہوا مگر بعض لوگ ترکی کا جواب لاطینی میں دیتے ہیں جیسے اتحاد سے کہو جب کوئی اینٹ کا جواب پتھر سے دے۔

ایران میں ایک شاعر جس کا نام خواجہ حافظ تھا اور اس نے خال و خد کے بدلے سر قندہ بنکارا کہنے کا وعدہ کیا تھا..... بد خواہوں نے تصور کے پاس جا کر اس کی چٹکی کھائی کہ دیکھتے حضور! آپ نے تو اتنی محنت سے سر قندہ بنکارا محنت کے اور بعض ایک خال سیاہ کے بدلے انہیں مفت بخش رہا ہے۔ یہ چٹکی کھانے والے ہر عہد میں ہوتے ہیں اور عارفانہ تہذیب و تمدن کے خلاف جو دوران زمانہ کو آکساتے رہتے ہیں۔ خود تو سر قندہ بنکارا محنت کے لئے بخش سکتے ہیں۔ اور ان کو بھی بخشش سے روکتے ہیں اور بخشش بھی کس چیز کی؟ صرف ایک غمراہ زاد کی ہونٹوں کے تار کی دیرانوں میں اچلا کر دے۔

عدلیہ کے بارے میں

”والسما عو وضع العیزان الاتطوعوا لہی العیزان والیمو الوزن بالقسط ولا تحسروا العیزان“

تین دفعہ میزان کا ذکر آیا ہے۔ آسمان کو اونچا کر کے انسان کے لیے توازن کا اصول قائم کر دیا تاکہ میزان عدل میں کمی نہ آئے اور فرمایا کہ توازن کو انصاف کے ساتھ قائم کر دو اور میزان کو خسارے میں نہ ڈالو۔ مگر جہاں قدرت نے آپ پر میزان کی اہمیت اتنی صراحت سے واضح کی ہے وہاں اس کا بھی خیال رکھا ہے کہ بعض دفعہ آپ کے خیالات میں غلطی آ جاتی ہے اور دیگر چیزوں کے ساتھ خود داری کا مال و متاع بھی بہہ جاتا ہے۔ اس لیے قدرت نے آپ کی مرشد میں بھی میزان توازن رکھا تاکہ اپنے کردار کے باوجود آپ ڈوب نہ جائیں بلکہ حیرتے رہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی عدل و انصاف کی راہیں ہیں؟ کچھ قانونی رکاوٹیں ہیں؟ کچھ کاوشیں ہم خود پیدا کر لیتے ہیں۔ جیسے کسی وکیل کو کوشش کرنے کے لیے ہم تمام امتیاز جاری کر دیتے ہیں۔ ایک دفعہ جب میں سمیرا جی تھا ایک شخص کا مقدمہ مذکورہ امداد ہوا نے کی وجہ سے خالی ہوا۔ اس نے کہا کہ یہ عدالت تو نہ ہوئی۔ میں نے لگی سے جواب دیا مگر میرے دل میں جی زبان پر نہ تھی اور جی کا سبب یہ تھا کہ میں بے اختیار تھا۔ میں نے کہا ”کون کہتا ہے کہ یہ عدل و انصاف کی جگہ ہے۔ یہ تو بکھری ہے اور آپ چین جانے کہ میری ساری مدافعی زندگی اسی عدالت اور بکھری میں توازن قائم کرنے میں صرف ہوئی ہے۔ ہائی کورٹ میں جس کو لوگ

ہوئے ہیں وہ بالکل زندہ ہیں بلکہ اس وقت بھی موجود ہیں۔ مرحوم کا مہم جو کچھ میرا مطلب یہ ہے کہ اللہ ان پر رحم کرے۔ کیونکہ وہ اب اثری جزل ہو گئے ہیں۔ اللہ بخشد انہیں جب بخشنے کا وقت آئے۔ عیساے آجھے آدی تھے۔ ادب کا ذوق رکھتے تھے۔ کبھی کبھی شعر بھی سنا دیتے تھے۔ مگر میری نظر ان کے کسی اور پہلو پر راقی تھی وہ کبھی کبھی کوئی غلط پڑتے تھے تو اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کرتے تھے اور اس کی نقل میرے پاس بھی بھیج دیتے تھے۔ میں پڑھ کر خوش ہوتا تھا۔ مگر خدا ان کی روح کو نہ شرماے۔ اب وہ اناری جزل ہو گئے ہیں۔

مرزا عبدالرب شختر نے ایک دن بتایا کہ ایک دفعہ پشاور کے ضلع میں ایک بہت بڑا جلوس نکلا۔ جس میں بڑے بڑے صاحبان ریش (ریشہ نیلی) اور ملا بھی تھے۔ اور قائد اعظم کو ساتھ لے جا رہے تھے۔ شختر نے ان کو خوش کرنے کے لیے کہا کہ یہ ملا لوگ کسی کی بھی قیادت نہیں مانتے اور خصوصاً انہوں کی جن کی ریش ہونہ بروٹ مگر آپ کے سامنے ان سب نے سر تسلیم خم کیا ہے۔ قائد اعظم نے جواب دیا تم جانتے ہو کیا؟ اس لیے کہ لوگ جانتے ہیں کہ میں اپنے لیے کچھ نہیں کہہ رہا۔ یہ تو ممکن ہے کہ ایسے لوگ مل سکیں جو بے دریائی سے آپ کے لیے کام کریں۔ مگر ان سے کام لینے کے لیے ایسا ہر ناما چاہے جو اولو اعظم ہو اور اس نقطہ میں قوت اراوی اس قدر بھری ہے کہ چیخروں میں بھی سب کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں ہوا۔ میں قائد اعظم کے لیے کوئی دعویٰ پیغمبری نہیں کرتا اور نہ اولو اعظمی صرف پیغمبروں کے لیے ضروری ہے۔ دنیا کے کام اس کے بغیر نہیں ہو سکتے اور چنانچہ اراہادہ قائم کیا جائے اتنا بڑا کام ہو سکتا ہے۔ یہ شیک ہے کہ قوت اراوی بہت حد تک ایک نیک اور ادرست ہے لیکن اس کا بڑا حاسا اس کا استعمال کرنا انسانوں سے عقل رکھنے کے خلاف قائد اعظم اکینے کیا کر سکتے تھے اگر آپ سب ان کے پیچھے نہ ہوتے۔

اقبال

اقبال اور قائد اعظم کے ذکر سے اس طرح میری حسرت تازہ ہو جاتی ہے کہ لوگ جان طور پر سمجھتے ہیں کہ مجھے ان دونوں سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی ہوگی مگر حقیقت یہ ہے کہ قائد اعظم کو صرف ایک قاصد سے دیکھا تھا اقبال کو تو دیکھا تک نہیں۔ سب سے پہلی چیز جس پر اقبال کی نظر پڑتی ہے وہ قرآن ہے۔ اس کے نزدیک قرآن کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان میں اس بات کا شعور پیدا کرے کہ اس کے تعلقات خدا سے ایک طرف اور کائنات سے دوسری طرف کیا ہیں۔ اسلام میں حقیقت اور مجاز دو مخالف طاقتیں نہیں بلکہ مجازی دنیا کی کوشش یہی راقی ہے کہ حقیقت پر روشنی ڈالے اور اس کو اپنا حصہ بنالے۔ اور اسی لیے وہ حقیقت کی حواس مجاز میں کرتا ہے۔ ”کبھی اسے حقیقت مختصر نظر آتا ہے اس لیے اس میں“

بچے سوں سے پر تھا۔ قائد اعظم بھی کسی کا غرض کے سلسلے میں وہیں تھے۔ مدت سے میری آرزو تھی کہ قائد اعظم سے ملوں۔ چنانچہ میں رکشا میں چڑھ کر ان کے مکان پر گیا۔ اگر میں آپ سے کہوں کہ جب میں ان سے ملا تو میں نے ان کو منہ مشورہ دیا جس پر انہوں نے فرمایا کہ آپ مجھے دو سال پہلے لے ہوتے تو پاکستان پہلے ہی بن گیا ہوتا تو آپ مان لیں گے اور ان کی انگوٹھوں نے آپ سے ایسی باتیں منوائی ہوں گی کیونکہ قائد اعظم تو اب ان کی تردید نہیں کر سکتے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جب میں ان سے ملنے گیا تو وہ مجھ سے نہ ملے اور میرے دل میں ان سے ملنے کی حسرت رہ گئی۔ میں نے ان کے سیکرٹری کو بتایا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں اس نے پوچھا کہ کوئی کام ہے میں نے کہا کہ کام تو کچھ نہیں صرف قرآنے زیارت سمجھ گئی تھی۔ اس نے کہا پھر وہ آپ سے نہیں ملیں گے۔ میں نے کہا۔ آپ میرا کارڈ تو لے جائیں۔ میرا خیال تھا کہ آئی سی ایس دیکھ کر وہ یہ تو سمجھ جائیں گے کہ شخص شاعر نہیں ہوں جو وادعوں اور پھاڑوں میں سمجھتے پھرتے ہیں۔ وقلو لون مالا تفعلون ”اور جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں“ مگر کیا پتہ سیکرٹری نے کارڈ دیکھا یا نہیں۔ ان کیس دیکھا تو خدا اسے بخشے۔ واپس آ کر اس نے میرے کارڈ کے ساتھ مجھے بھی واپس کر دیا۔ میں ہار کر اکیلا رہا محسوس کرنے لگا جیسے کسی نے کہا جائے کہ تم کو کسی سے ڈس کر دیے گئے ہو۔ کچھ دیر گزارا ہاتا کہ سر میں جو پیکری کیفیت تھی اس پر قابو پاؤں پھر رکشا کی طرف چلا۔ اسے میں میں نے دیکھا کہ رکشا میں سوار کوئی ان کے گھر سے نکلا۔ اخباروں میں جو قصوریں نکلا کرتی تھیں ان سے سی نے بچپان لیا کہ کبھی قائد اعظم ہیں۔ میرا یہ حذر وہ چہرہ ایک دم تازہ ہو گیا اور میں نے فوراً ڈرائی میں بڑے اشتیاق سے سلام کیا انہوں نے ایک کشادہ جسم سے میرے سلام کا جواب دیا۔ بس میں سمجھا کہ میری زیارت ہو گئی ہے۔

1947ء میں جب پاکستان بنا تو ملاقات کی حسرت مٹانے کا پھر ایک موقع آیا۔ گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں وہ بطور گورنر جزل قیام پزیر تھے۔ ہم سب کو دعوت دے آئے اور ساتھ ایک ایک کارڈ بھی جس پر اپنا نام لکھنا تھا۔ تاکہ اس کارڈ کو دیکھ کر گورنر صاحب کو تعارف کرانے میں سہاوت ہو۔ میں بڑے شوق سے چلا۔ عبدالرحمن خاں جواب ہمارے ایک ہی جگہ میرے ساتھ تھے۔ راستے میں ایک مقام پر سڑک کی حسرت ہو رہی تھی مولو کار کا ایک پیوہاں کر گیا۔ میری مولو کار کا پیوہاں سال میں ایک دو بار ضرور کسی ایسی ہی جگہ گرتا ہے۔ اس چھوٹے سے حادثے کی وجہ سے ہم تقریباً آدھ گھنٹہ دیر سے پہلے۔ تعارف کی تقریب ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ گو وائس واپس بھی قائد اعظم سے ہاتھ ملانے سے محروم رہا۔ دوسری سے دیکھتا رہا۔ گو بہت تعہدیت اور فرسے دیکھتا رہا۔ اس آرزو کی راہ میں ایک دفعہ پھر گری پیدا ہوئی۔ جب کئی سال بعد میں نے محترمہ فاطمہ جناح سے ہاتھ ملائے۔ یہ واقعہ چودھری نذیر احمد خاں مرحوم کے مکان پر ہوا۔ آدھا تو اب ان کی روح کو ملا۔ مرحوم سے کہیں بے گھٹے گا کہ خدا ان سے وہ سرگشاں

ہاتوں کا خیال نہیں کیا جو میرے ارادے کو کھڑ کر رہی تھیں۔ میں نے دل میں کہا آپ مجھ سے بہت اونچے ہیں۔ خدا آپ کو جنس شیر احمد خاں کر دے۔ ایک پھانسی کسی کو اس سے زیادہ اور کیا عداوت کر سکتا ہے۔ وہ خان کے بغیر انسان کی شخصیت کو مکمل بھتا ہے اور شخصیت کو کھڑے ستارہ تصور ہو تو ایک خان نام کے شروع میں لگا دیتا ہے۔ مثلاً جنس خاں شیر احمد خاں۔ مجھے امید ہے کہ میری دعا جلد قبول ہو جائے گی۔ خبر چھوڑ ہے اس قصے کو جو بات میں واضح کرنا چاہتا تھا وہ یہ تھی کہ میرا عمل بے وضو تھا یعنی میرے ارادے کی کمزوری اس کی تکمیل میں حائل تھی۔ اور شیر جیسے لوگ ہمیشہ با وضو رہتے ہیں۔

جنس رحمن

کتاہوں کو دیکھتے ہوئے جس کتاب پر نظر پڑی ان کا نام تھا ترجمان اسرار جو اسرار خودی کا منظوم ترجمہ ہے اور جس کے مترجم ہیں ڈاکٹر جنس علی محمد رحمن جنہوں نے رحمن کا بندہ بننے سے پہلے یہ تین ہفت خواں سر کیے ہیں۔ یہاں آپ (رحمن اور بنت کے) تھاد سے پریشان نہ ہوں، وہ ہزار ہا سال سے میرے دوست ہیں مگر ان سے مجھے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ چوری سے کام کرتے ہیں۔ انہوں نے کبھی اشارہ بھی نہیں بتایا کہ وہ اتنا بڑا کام کر رہے ہیں۔ اور کچھ کہتا ہوں کہ اس دوران میں نے ان کے چہرے پر خوش اخلاقی کی لاتعداد اسکرانوں کے باوجود ایسا کوئی جسم نہیں دیکھا جس میں اقبال کی جھلک ہوتی۔

مگر اس کتاب سے (یعنی ترجمان اسرار سے) میں نے بہت کچھ سیکھا خصوصاً جنس رحمان کے سر آغاز اور ڈاکٹر ظیفہ عبدالحکیم مرحوم کے مقدمے سے اور سب سے بڑی بات یہ سیکھی کہ خودی یہ نہیں کہ کتابیں نہ پڑھوں اور دوسروں کے علم سے بے بہرہ رہ کر اپنے ذاتی عرفان میں ہی مست رہوں۔ اور اس کی خودی سے اپنی خودی کا مقابلہ کرنا ضروری ہے ورنہ خودی فرد کی خودی خدائی بن جاتی ہے اور اس آغاز میں جس خواب سے جنس رحمن نے آغاز کیا ہے اس نے تو مجھے بے خود کر دیا۔ خواب یہ تھا کہ علامہ اقبال اپنے بے شکا لفظ اعجاز سے محفل بنائے بیٹھے ہیں۔ احباب جمع ہیں کہ اسے میں رحمن تکلیف جاتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر بیٹھنے سے وہ نہیں چوکتے اور نشست بھی اچھی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں تو علامہ اقبال نے خود ان کو اپنے پاس بٹھالیا۔ خواب کے بعد خیال کی باری تھیں۔ وہ عید نکلی تو آیا۔ انہوں نے کچھ دن بعد جنس رحمن کو کھلا جس میں اسرار خودی کے منظوم ترجمے کی ضرورت پر اصرار تھا۔ عید نکلی اس کی اس خدمت کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ خواب کی تعمیر بنے ورنہ جنس رحمن اب تک خواب ہی دیکھا کرتے۔ جنس رحمن کا یہ خواب اتنا فدا رانہ نہ تھا۔ مگر انہوں نے یہ فدا رخی ضروری کی کہ اقبال سے وعدہ لے لیا کہ آئندہ کسی بیچ کے خواب میں نہ آئیں چنانچہ میں نے کبھی ان کو خواب میں نہیں دیکھا۔

اقبال کی شاعری قرآن کی آیات سے ملے ہے۔ پڑھنے والوں کے علاوہ سننے والوں کو بھی با وضو ہونا چاہیے اور کچھ نہیں تو نجمی سہی۔ ممکن ہے آپ کی تقدیر میں نجم ہی لکھا ہو مسلمان جو ہوئے۔

حمید نظامی

اقبال اور قاسم عظیم کا ذکر کرتے ہوئے مجھے حمید نظامی یاد آتے ہیں۔ کہتے ہیں دنیا عالم حسرت ہے۔ مثلاً اپنے والد کی آخری بیماری میں جب میں تعطیلات گرما کے بعد لاہور آ رہا تھا۔ تو انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ کچھ دن اور ٹیبر جاؤں۔ میں نے غور کیا کہ ہائی کوٹ کے مکملن کے وقت چٹیف جنس کی موجودگی ضروری ہے۔ یہ ٹیکہ ہے کہ ان کی وفات کے وقت میں ان کے پاس موجود تھا۔ مگر یہ حسرت دل میں میری کہ ان کی آخری خواہش میں نے پوری نہ کی۔ اس طرح کی حسرت حمید نظامی کے متعلق ہے مگر وہ ان کی حسرت خیال کی بنا پر ہے۔ جب ایک ایسا آدمی جو اعتدال سے بھی آگے نہ بڑھے مگر اعتدال پر کھڑے ہو کر اقیانوس کے بے پایاں حدود دکھائے جو دلیرانہ جتنا چاہے نہ تامل کی قسارت رکھتا ہو نہ صدمہ کی پردہ اوہ ہمارے درمیان سے اٹھ جائے تو محفل حسی ہوتی ہو جاتی ہے۔

جنس شیر احمد

کچھ بچے تھے میں لاہور میں تھا شام کے وقت اپنے باغ میں کام کر رہا تھا کہ سڑک پر کسی کے کرانے کی آواز آئی میں نے اپنے بعد اس پر چھاپا کیا بات ہے اس نے کہا ایک لڑکے کے پیٹ میں سخت درد ہوا جس سے وہ ہوش ہو گیا ہے۔ میں نے کہا اس کو گھر پہنچانا چاہیے۔ اس نے کہا گھر کا پتہ معلوم نہیں۔ لوگ گزرتے ہوئے دراز ٹیبر جاتے ہیں۔ پھر اس کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا چلو ہسپتال ہی پہنچا دیں۔ مگر جوں جوں میں سڑک کے قریب ہوتا گیا میرے دل میں یہ دہم بڑھتا گیا کہ اگر اس لڑکے کو ہسپتال ہوا تو مجھے بھی بیماری لگنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ میرا ارادہ کمزور ہوا تھا اس میں غباری مفلوت پیدا ہو رہی تھی۔ اس شش و پنج کی حالت میں میں موقع پر پہنچا۔ وہاں دیکھا کہ ایک موٹر پہلے ہی تکلیف تکلیف تھی اور لڑکے کو موٹر میں لٹا دیا گیا تھا۔ ایسے وقت کوئی پہنچے تو فرشتہ رحمت کہلاتا ہے۔

جب میں نے دیکھا کہ اب میری موٹر کی ضرورت نہیں رہی تو میں بھی موٹر پیش کرنے پر تیار ہو گیا۔ زیادہ تر ایک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ فرشتہ جنس شیر احمد ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ایک آدمی مل گیا ہے جو ہمارا گھر جاتا ہے۔ جنس شیر احمد نے ان

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ (خطبہ ایم اقبال)

میں سوچ رہا تھا کہ یہ تقریر کیسے شروع کروں سوائے اس کے سب تعریف اللہ کے لیے ہے۔ اور پھر کئی صدیاں چھوڑ کر اقبال اور قاضی کاظم پر لگا پھرتی ہے اور پھر اس پلے کے منتظمین میری تعریف کریں گے اور میں کس قسمی کروں گا۔ بلکہ یہ کہوں گا کہ اگر بات صرف ان حضرات کے اختیار کی ہوتی تو میں کب کا بزرگ بن گیا ہوتا اور بکری کا دودھ اور دو کاغذی لیٹوں میری غذا ہوتے۔ لیکن بکری کا دودھ پی کر آپ پھینے کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور دنیا کی سیاست پر اس وقت بھیڑیا حاوی ہے۔ اس لیے مجھے بھی کچھ دن بھیڑیا کا دودھ پینی لینے دیجئے۔ اپنے حلق تعریف کا لفظ شاید میں نے غلط استعمال کیا ہے۔ مجھے تعارف کہنا چاہیے تھا کیونکہ جو حضرات مجھے یہاں لائے ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس محفل کے ذریعے ادب سے مجھے حصارف کرا لیں۔ اور عینی طور پر اہل ادب سے میرا تعارف بھی کرا دیں۔ اب چونکہ میری گستاخیاں مشہور ہو گئی ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ادب کے میدان میں بھی مجھے بے ادبی پر آکھیں۔ بہر حال تعریف اور تعارف کے معاملے میں زیادہ الجھنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ سنا ہے کہ جب ایک نیک مسلمان کسی نے پچھا آپ کی تعریف؟ تو اس نے سادگی سے جواب دیا ”بھائی! ہماری کیا تعریف ہو سکتی ہے تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا۔“ فرض تعارف ایسا ہونا چاہیے کہ لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا نہ کرے۔ مثلاً میں اگر فارسی یا اردو ادب کا پروفیسر ہوتا تو آپ توقع رکھ سکتے تھے کہ اقبال کے متعلق کوئی ایسی بات کروں گا جو طالب علموں کے لیے سمجھ میں نہ آ سکے۔ مگر یہ صاحبان جو مجھے یہاں لائے ہیں خود جانتے ہیں کہ میرا سرمایہ ادب کس قدر محدود ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فارسی جانتے کے سب اگر میں دو پار شعر فارسی کے چڑھ دوں تو میں اس موقع کے لیے کافی ہوگا۔

حضرات! اسی لیے میں اپنا تعارف خود کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ میں اس دنیا میں نووارد ہوں۔ صرف پچاس سالہ برس ہوئے کہ یہاں آیا ہوں۔ (اگر آپ نے برناؤ شا کا کھیل BACK TO METHUSELAH پڑھا ہو تو آپ میرے نووارد ہونے پر حجب نہیں ہوں گے) اور اس عمر میں اقبال کے تین شعر بھی میں نے یاد کر لیے ہیں۔ اگر یاد رہا تو آپ کو سناؤں گا۔

تیسرے رجن وہ ہیں جنہوں نے اپنا عہدہ میرے سپرد کرنے کے باوجود اپنی روحانی شاعری میں سے ایک شعر بھی میرے لیے تر کے میں نہیں چھوڑا۔ حالانکہ لوگ اس غلط فہمی میں مجھے ادبی جلسوں کی صدارت کے لیے جاتے ہیں۔ کہ میں نے ان کا عہدہ سنبھالا ہے تو ان کے اٹائے پر بھی قبضہ کر لیا ہوگا۔

فخ کرنے سے پیشتر ایک غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ یہ پہلا موقع نہیں کہ میں سن رہا ہوں کہ جنس رجن نے مجھے دریافت مسمیٰ میں کچھ دیا ہے۔ اردو فلم و قاری کے تھے او علم ادب سب وہ ساتھ لے گئے اور آج میں اعلان کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے پاس سوائے ایک چاندی کے گرز کے اور کچھ نہیں چھوڑا ہے اور وہ گرز بھی زندہ اٹھانے تھے اور نہ میں اٹھاسکا ہوں۔ البتہ ایک مڑیہ انہوں نے چھوڑا اور وہ بھی میرے مرنے پر لکھا تھا۔ یہ 1926ء کی بات ہے جب ہم و لا بیت میں تھے۔ میں سنا رہا ہوں تاکہ آنکھ وہو کی اور چڑ کا دعویٰ نہ کر سکیں۔

سوچتا	قا	کہو	سما	رستم
آئی	آواز	م	سما	رستم
جب	کبھی	یاد	اس کی	آجلی
اس کی	کی	شوفی	مجھے	ستائلی

”زندگی کے بارے میں کیا خیال ہے۔“

زندگی کا کیا ہے؟ کچھ نہیں سوچا جب تک ہے تو اس کی اجیت لگی ہے جب نہ ہوگی تو اپنی اجیت بھی ساتھ لے جائے گی۔ کچھ دن چراغ جلے گا۔ پھول چڑھائے جائیں گے۔ اس کے بعد پھر وہی حسرتوں کی دایاں اور ہزار نامردیاں



میں اپنی خودی کو اس درجہ استوار کیا کہ کہتے کاروان کے مختصمیں مسخر ہو کر وہ کتاب مجھے تحفہ دینے پر مجبور ہو گئے اور میں اس خیال سے کہ ان کی خودی کو گھٹیں نہ لگے کتاب لینے پر مجبور ہو گیا۔

اب اگر آپ کو خودی کے کچھ پہلو نظر آئے گئے ہوں تو میں آگے چلوں۔ میری کمزوری یہ ہے کہ اگر کتاب میں کچھ پڑھ لیتا ہوں تو اسے سچے مسلمان کی طرح صحیح مان لیتا ہوں۔ میں نے اقبال کی ایک نظم کرم کتابی پڑھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے کتاب میں پڑھنا چھوڑ دیں۔ کرم کتابی اس کیڑے کو کہتے ہیں جو کتابوں میں پیدا ہوتا ہے اور ان کے اوراق کو چاٹ جاتا ہے۔ استعارے میں اس پڑھنے والے کو بھی کرم کتابی کہتے ہیں جو کتاب ہی پر حصار ہے اور زندگی کی حرارت سے اور دنیا کے سوز و ساز سے آشنا رہے۔ پانچ شعر کی نظم ہے آپ بھی سن لیتے۔

شہیدم ہے در سب خانہ من
پر دانہ می گفت کرم کتابی

ایک رات میری لائبریری میں ایک کتاب کا کیزا پر دانے سے شکایت کر رہا تھا۔

ہم تیرہ روزم ز ہے آفتابی
مرفعم نصمین

مگر زندگی کی حقیقت کچھ کچھ میں نہ آئی اور تیار کی بدستور کاغذ مری۔ پر دانے نے کیا اچھا جواب دیا۔

کو گفت پر دانہ نیم سوزے
کہ میں نکندہ را اور کتابے ناپائی

کہ یہ کچھ جتنی کہ کتاب میں نہیں ملے گا۔ کیا کہتا؟

تیش کی کند زندہ تر زندگی را
تیش می دہد ہال و پ زندگی را

زندگی جس چیز سے زندہ رہتی ہے وہ تیش ہے گرمی ہے محبت ہے حس ہے۔ زندگی کی مشکوں سے لڑا ہے اور یہ باتیں کتابوں کے پڑھنے سے نہیں آتیں۔

اس وقت تو مجھے ایک سردار صاحب کے تین راگ یاد آ رہے ہیں۔ سردار جی کے دوستوں میں علم موسیقی سے ان کی واقفیت کا بہت چرچا تھا۔ ایک دوست نے پوچھا کہ سردار جی کچھ راگ کتنے ہیں؟ جواب دیا کہ تین؟ ایک تو ہے بالکل سب ایک کوئی اور ہے اور تیسرے کا نام میں بھول گیا ہوں۔ کتنے ایسے لوگ تھے خود چلے گئے اور قہقہے چھوڑ گئے بلکہ بعض قہقہے پٹناؤں کے پیر کر گئے مگر اس ڈر سے کہ کہیں سردار جی کے تین راگوں کا قصہ یہاں نہ دہرایا جائے۔ میں نے تین شعر سنے سرے سے یاد کر لیے ہیں۔ سناؤں گا بعد میں اگر یاد ہو اور وہ شعر بھی یاد رہے۔ مگر یہ یاد ہے کہ میں شروع ہی سے اقبال جرم کر رہا ہوں۔ اور یہ جرم اقبال کی شاعری کے حلقے ہو تو بڑا جرم ہے اور اقبال جرم کرنے والا بھی ایک درد دار اور ہو گا اس لیے کبھی تعریف ہے۔

اور یہ تین شعر بھی مجھے جس طرح ملے وہ بھی ایک حسین اتفاق ہے۔ کچھ دن ہوئے ایک کتابوں کی نمائش کے افتتاح کے موقعہ پر میں نے مذاق کیا کہ اگر کتاب میں کسی کو قہقہہ دی جائے تو ان کی قہقہہ بڑھ جاتی ہے۔ اب اگر کوئی مذاق کے ذریعے اپنا مذاق بڑھا کر لے تو اسے شاعری کے تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ حسن مطلب کے لیے شعر ضروری نہیں۔ مجھے سوال کا یہ طریقہ پسند ہے کہ مطلب بھی حاصل ہو جائے اور خودی بھی ہاتھ سے نہ جائے وہ خودی جس کے بارے میں کسی نے کہا ہے خودی جو خودی موت ہے گھر میں رہتی ہے اور شاید اسی لئے اس پر وہ فطین کی حفاظت اور بھی ضروری ہے۔ القہہ نمائش میں کتابوں کو دیکھتے ہوئے جس کتاب پر نظر پڑی اس کا نام قاتر تہمان اسرار اور جو اسرار خودی کا منظوم ترجمہ ہے اور جس کے مترجم ہیں ڈاکٹر جمشید علی عبدالرحمن جنہوں نے حسن کا ہندو پنشن سے پبلیشمنٹ خزان سرکیے ہیں۔ یہاں آپ (تین اور ہفت کے تقاریر سے پریشان نہ ہوں) وہ ہزار ہا سال سے میرے دوست ہیں مگر ان سے مجھے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ چوری سے کام کرتے ہیں۔ انہوں نے کبھی اشارہ بھی نہیں بتایا کہ وہ اتنا بڑا کام کر رہے ہیں اور کچھ کہتا ہوں کہ اس دوران میں میں نے ان کے چہرے پر خوش اخلاقی کی لاقعد اور مسکراہٹوں کے باوجود ایسا کوئی جسم نہیں دیکھا جس میں اقبال کی جھلک ہوتی۔ ورنہ میں خود ان کے پاس جاتا اور ان تین اشعار میں سے جو میں نے یاد کیے ہیں ایک آدھ مصرعہ پڑھ کر ان کی طبیعت میں اضافہ کرتا اور ان کو موقع دیتا کہ میرے حلقے بھی کچھ نکلیں۔ مگر ان صاحبان کو سوائے نعلیے اور برگساں کے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ ہیرم کوٹ میں جا کر لارڈ کنگلی نظر آنے لگتا ہے (لارڈ کنگلی کا قصہ پھر سناؤں گا غیر خدا ہر ایک کو اپنی نیت سے گمراہے۔ میں تو ترجمان اسرار کو کچھ اور بخود ہو گیا بلکہ میری ساری خودی کا نور ہو گئی۔ لیکن شاید وہ کیفیت بھی میری خودی کا ایک مظاہرہ تھی کیونکہ اسی کتاب میں میں نے پڑھا کہ جب خودی عشق و محبت سے مضبوط ہوتی ہے تو نظام عالم کی ظاہر اور پوشیدہ قوتوں کو سخر کر لیتی ہے۔ چنانچہ میں نے اس کتاب کے عشق و محبت

پروانے کی ہی نصیحت سن کر میں نے بھی کتابیں پڑھنا چھوڑ دیں۔ مگر اس کتاب سے (یعنی ترجمان اسرار سے) میں نے بہت کچھ سیکھا۔ خصوصاً جنس رجن کے سرآغاز سے اور ڈاکٹر علی محمد علی رحمہ اللہ مرحوم کے مقدمے سے اور سب سے بڑی بات یہ سیکھی کہ خودی یہ نہیں کہ کتابیں نہ پڑھوں اور دوسروں کے علم سے بہرہ ور نہ کر اپنے ذاتی مرقان ہی میں مست رہوں اوروں کی خودی سے اپنی خودی کا مقابلہ نہ ضروری ہے۔ ورنہ خودی فرد کی خدائی نام جاتی ہے اور سرآغاز جنس خواب سے جنس رجن نے آغا کرنا ہے اس نے تو مجھے یہ خود کر دیا۔ خواب یہ تھا کہ علامہ اقبال اپنے بے تکلفا نہ انداز سے محفل جمائے بیٹھے ہیں۔ احباب جمع ہیں کہاتے ہیں جنس رجن کھلی جاتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر پہنچنے سے وہ نہیں چوکتے اور شست بھی ابھی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں تو علامہ اقبال نے خود ان کو اپنے پاس بٹھالیا۔ خواب کے بعد خیال کی باری تھی۔ وہ صیغہ نکالی تو آیا۔ انہوں نے کچھ دن بعد جنس رجن کو کھلا لکھا جس میں اسرار خودی کے مضمون ترتیب سے کی ضرورت پر اسرار تھا۔ صیغہ نکالی کی اس خدمت کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ خواب کی تعمیر ہے۔ ورنہ جنس رجن اب تک خواب ہی دیکھا کرتے۔

میں سو چا شاید میں بھی کوئی خواب دیکھوں مگر نہیں دیکھا۔ میں نے خواب دیکھنا بھی ہوں تو اور چیزوں کے۔ بہت سال ہوئے جب ہندوستان میں جنگ آزادی جاری تھی تو کسی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ آزادی آ رہی ہے گھوڑے پر سوار۔ یاد نہیں کہ اس نے گھوڑے کہا تھا یا بھیڑ یا۔ بعد میں بھیڑی بھی کافی تعداد میں آئے۔ بہر حال خواب دیکھا کہ آزادی آ رہی ہے اور اگر بڑا اپنے بستر گول کر رہے ہیں۔ اس تقریر کے نتیجے میں پلٹیں میں اس پر مقدمہ چلا دیا کہ یہ حکومت کے خلاف حرکت پھیلاتا ہے۔ بمسٹر ریٹ نے قیدی کی سزا دی۔ میں نے بطور سیشن جج اعلیٰ بنی۔ بستر گول کرنے پر مجھے نی آئی۔ مجھے فنی بھی آتی ہے مگر زیادہ تر وہ آتا ہے۔ میں نے کہا کیا کسی کو یہ بھی اجازت نہیں کہ آزادی کے خواب ہی دیکھ سکے۔ فرض میں نے اسے چھوڑ دیا۔ خوابوں کا مجھ پر بہت اثر ہوتا ہے۔ اسی لیے میں بکھری میں آدھا وقت سوچتا رہتا ہوں۔ جنس رجن کا یہ خواب اتنا نادرانہ نہ تھا مگر انہوں نے یہ بخاری ضروری کہ اقبال سے وعدہ سے لیا کہ آدھ کسے جج کے خواب میں نہ آئیں۔ چنانچہ میں نے بھی خواب نہیں دیکھا۔ اس وقت مجھے فنی کا قصہ یاد آ رہا ہے جو بے گم ہونے کے باوجود سناٹے دیتا ہوں تاکہ سندر رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ اگر آپ نے کسی اور طرح سے سنا ہوتا وہ بھی الیک ہے۔ فنی نے سنا تھا کہ جب سعدی نے یہ شعر کہا۔

برگ درختان بہرود نظر ہو بشار
بر درخت دفتریت معرفت کردگار

سبز درختوں کا پرچہ خدا کی معرفت کا دفتر ہے۔ جب سعدی نے یہ شعر کہا تو آسمان سے فرشتے اس کے لیے غلعت لے کر اترے۔ یہ تو یاد نہیں کہ ایک فرشتہ تھا یا دو۔ مومن اور دودھ پھر تے ہیں۔ اور یہ بھی یاد نہیں کہ انہوں نے پر لگائے تھے یا حضرت ابراہیم کے مہانوں کی طرح بازوؤں کے بغیر تھے مگر شعر معرفت کا تھا اور وہ غلعت لائے پر مجبور ہو گئے۔ ویسے آپ کو یاد ہوگا کہ فرشتے ایسے موقعوں پر ہمیشہ غلعت کرتے رہے ہیں اور خدا سے یہی کہتے رہے ہیں کہ یہ لوگ دنیا میں فساد کرتے ہیں اور غلعت تو ایک طرف کسی آئینے پر بھی نہیں چلی سکتے۔ اور ”عظم بعض عدو“ ایک کا ایک دشمن ہے اور ”فی الارض مستقر“ ان کے گھر بھی ہیں اور گھر گھر میں بڑے بڑے ننگے ہیں جو بنا کر بیٹھے ہیں اور وہ بھی نفع پر خصوصاً کراچی میں (یہ کراچی کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ میں اپنی طرف سے کہتا ہوں۔ مگر خاکم بدین۔ بعض باتوں کا خدا نے بھی ذکر نہیں کیا ہے۔) اچھا ”فی الارض مستقر“ مکان تو ہیں ”مناخ الی سین“ وہ بخیر تہ توڑے وقت کے لیے ہیں۔ یہ قسمیں ہند کے فوراً بعد کے واقعات ہیں جن کا ذکر قرآن میں ہے۔

صاحبان! میں بے رہا باتوں کا شکار رہا ہوں۔ میں فنی کا ذکر کر رہا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ فرشتے سعدی کے ایک شعر کے صلے میں غلعت لائے تھے۔ اس نے بھی شعر کہا۔

بر گیا ہے کہ از زمیں روی
دودہ لا شریک نہ گوید

گھاس کا ہر سراجوز میں سے لکھا ہے خدا کے ایک ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ شعر کہہ کر وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ مجرم جمہ شعر پر حا اور فرشتوں کا انتظار کرتا رہا فرشتہ تو کوئی نہ آیا۔ ایک پرندہ ادھر سے گزرا آدھ وہ بھی پر والی تھوڑے بے پرندہ زیادہ نزدیک تو نہ آیا اور بے پیغام دے کر چلا گیا۔ پیغام بیت کی صورت میں تھا جو فنی کی ڈاڑھی پر گری۔ فنی نے آدھ دیکھنی اور حسرت سے کہا۔ ”قد روانی عالم بالاطلوم شد“ میں نے نہیں کہا تھا کہ آپ اس قصے کو کج سمجھیں۔ ممکن ہے یہ قصہ فنی کے کسی مخالف نے گھڑا ہو کہ نہ کہ خالین انکھرا ایسی باتیں گھڑتے رہتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جب میں نے نہ خواب دیکھا نہ غلعت کا اعزاز پایا۔ نہ فنی کی طرح اپنے آپ کو کسی غلعت کا مستحق سمجھا تو پھر کس حیثیت سے اس پلٹ فارم پر کھڑا ہوں۔ نہیں حضرات یہ مجھے پسند نہیں کہ آپ کسی کو غلعت اس کے عہدے کے لحاظ سے یہاں کھڑا کر دیں۔ یہ ہم دونوں کی خودی کے منافی ہے۔ آپ اس چیز کی قدر کریں جو کسی کو یہاں خطاب کرنے کا اہل بناتی ہے۔ ایک رسالے کے مدیر نے ایک بار مجھ سے ملاقات کی خواہش کی۔ اس نے لکھا کہ وہ مختلف مسائل کے حلق میرے خیالات معلوم

بدایا فلک دہا موحل در آدج
حیات چلت چارواں امد متیزاست

دریائے کی لہروں سے لڑو۔ اصل زندگی جدوجہد میں ہے۔ زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ہونا انہیں حل کرنے کی کوشش کرو۔ ہر بات اس طرح سے نہ مان لیا کرو جیسے سورج مشرق سے لگتا ہے اور مغرب میں ڈالتا ہے۔ زندگی میں بہت سکون ہو تو سانس کو بند نہ کرنا۔ حرکت ہی زندگی کی نشانی ہے۔ جتنی کام گاڑی ہے ٹھکری ہو تو لوہے اور ٹھکری کے ذبہ ہیں۔

سامل اتادہ گفت گرچہ بے زبستم
بچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موج ز خود رفت سحر خرامید و گفت
بستم اگر می روم گرنہ روم بستم

سامل ایک جگہ پر ٹھکرا ہے کہتا ہے کہ اتنی زندگی گزری مگر معلوم نہ ہو سکا کہ میں کون ہوں۔ موج سامل سے ٹکرا کر بولی۔ دیکھا میں گرائی تو موج کہاٹائی اگر سناکت راتقی تو معدوم ہوتی۔ میرے بھانجے اتم بھی موج کی طرح غریب ہیں۔ غریب نہیں تو خرامی کرو۔ جنش میں آ جاؤ مگر ہاں کچھ کچھ جنش تو اب نظر آ رہی ہے۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد ایک شور یہ دھر شاعر نے جو ریلوے میں ملازم بھی تھا بڑے دور سے کچھ شعر کہے جن میں ایک یہ بھی تھا۔

دیکھتا کیا ہے میرے منہ کی طرف
قلم اعظم کا پاکستان دیکھ

میں ان دنوں حکومت کا قانونی مشیر تھا۔ وہ محمود اشعار میرے پاس آیا کہ بتاؤ۔ اس پر کون سی دفعہ لکھی ہے۔ میں نے کہا خدا کے بند اور تو صرف جی کہتا ہے کہ میرے منہ کی طرف کیا دیکھتے ہو یا پاکستان کی طرف دیکھو کیا یہ وہی ملک ہے جو قلم اعظم نے تراشا تھا۔ اگر آپ اس کے منہ کی طرف دیکھنا چاہتے ہیں تو خوشی سے دیکھیں۔

مجھ سے رائے لینے والے بھی ایسا ہی کرتے رہے تھے نہ اس خودی کو جو قوم میں پیدا ہو گئی تھی انہوں نے ترقی دی اور نہ سمندر کی

کر کے اپنے رسالے میں شائع کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے کہنا کہ تھوڑے عرصے تک میں اپنی معاذ ملامت ختم کر کے اپنے گھر چلا جاؤں گا۔ گاؤں میں ایک چھوٹے سے باغ میں چٹہ کر گاؤں میں بیٹھ لگاؤں گا۔ اگر اس وقت بھی میرے صاحب مجھے اس قابل سمجھیں کہ دنیا کے اہم مسائل کے متعلق میری رائے پوچھیں تو مجھے لطف آئے گا۔ اس وقت تو میری رائے سزاواری ہوگی۔ میرے صاحب نے پھر نہیں پوچھا اور نہ پھر گاؤں میں پوچھیں گے۔ مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا عہدے کے اعزاز کے بغیر کوئی انسان نہیں رہتا؟

میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس پلیٹ فارم کا درجہ اتنا بڑھا لیں کہ چیف جسٹس خود اس کی طرف دوڑتے ہوئے آئیں اور شاید کسی ایسے ہی مقام پر اقبال نے کہا ہوگا۔

خودی کو کر بند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے تا تیری رضا کیا ہے

کہتے کو تو ابھی بات ہے مگر خودی کو بند کیسے کریں اور کیا خدا بندے سے سچ سچ اس طرح کا سوال کرتا ہے۔ اقبال میں یہی تو غوی ہے کہ اس کی بات نہ کر آپ نہ سمجھیں کوئی ممکن سمجھتے تھے ہیں۔ دل خوش ہوتا ہے کہ اپنی ہستی پر اعتبار نہ لگتا ہے ہم تو انہیں ہم اولو اعظم ہیں ہم انہیں اے کے مالک ہیں کیوں خدا سے سوال کریں۔ خدا خود ہم سے پوچھتے گا اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک دفعہ کسی نے یہ اعلان کے طور پر کہا کہ اب ہر کام میری مرضی کے مطابق ہوتا ہے اور اعتراض کیوں کی میں کوئی خواہش ہی نہیں کرتا اپنا کام کیسے جاتا ہوں اور جب کچھ ہوتا ہے تو سمجھتا ہوں یہی حکم ہے جو اللہ کی مرضی وہ میری مرضی۔ یہ ہوا ایک مطلب۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ "الہی منی والا اقام من اللہ" یعنی کوشش تو میری ہوگی اور اس کی تکمیل خدا کے ہاتھ میں ہے بلکہ اقبال تو کہتا ہے کہ کوشش تو وہی ابھی ہے جو جاری رہے اور ختم ہی نہ ہو۔

راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

اس کا مطلب آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ جو کام آپ کے سپرد ہوا ہے آہستہ آہستہ قسطوں میں کرتے رہیں تاکہ کبھی ختم ہی نہ ہو۔ یہی بات فارسی میں یوں ادا کی ہے۔

ہے کہ بندے کو بھی خدا سے یہ پا چھنے کا حق حاصل ہو گیا ہے یہ کس طرح کی دنیا بانی ہے تو نے؟

صد جہاں ی روید از کشت خیال ماچوں گل

یک جہاں داں ہم از خون قنا ساختی

ہمارے خیال کی کھیتی ہے تو سنگلوں عالم وجود میں آتے ہیں تو نے تو ایک دنیا بانی ہے اور وہی آرزوں کے خون سے۔ "اے چہ جہت خانہ مرد و فر داساختی"

مگر ان اشعار کا لطف آپ کو ب آئے گا۔ اگر آپ قہوڑی بہت لاری جانتے ہوں یا کوئی ایسا لاریاں کاں کیا ہو جس کے سبب شیطان کے ہم مشرب قرار پا گئیں۔ شیطان کو پہلی دفعہ ملنے کے بھنے کی کوشش کی تھی۔ بڑے جرم کا مرتکب ہوا تھا۔ آخر بڑی مصیبت رکنا ہوگا جو خدا سے کہہ سکا کہ آؤ! کو تو نے مٹی سے بنا لیا اور مجھے آگ سے۔

نوری جہاں نیم سجدہ پہ آدم بزم

او پہ نہادست خاک من پہ نژاد آذر دم

میں کوئی نادان فرشتہ ہوں کہ آدم کو سجدہ کروں۔ شیطان کی اس جرات پر دل میں عزت میں عزت پیدا ہوتی ہے اور اقبال تو ہمدردی بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اگر قرآن سے یہ معلوم نہ ہوتا کہ آدمی کا کیا قصور تھا اور شیطان نے کیا نافرمانی کی تھی تو اقبال کو بڑھ کر تو میں یہ سمجھتا کہ دونوں بظاہر دونوں پر غلظ ہوا ہے۔ ہماری تصویر صرف یہ تھی کہ گندم کا دانہ کھایا اور اس کی خطای یہ کہ اس نے آدم کو سجدہ نہ کیا اب دونوں ناخوش ہیں۔

جرم ما از دانہ تصویر او از سجدہ

نے ہاں بظاہر می سازی نہ ہاں ساختی

مگر حق جو مجھے تو حقنے کا باعث گندم کا دانہ ہے اور ہم ابھی گندم کو نہیں چھوڑے بلکہ اس نگر میں گئے ہیں کہ کس طرح کھاد کے استعمال سے اس کی پیداوار بڑھا سکیں۔ البتہ بنگال والے تو اس دان سے ایسے ذرے ہیں کہ اگر قسط سالی بھی ہوتو چاول ہی مانگتے ہیں اور سنا ہے کہ بعض اوقات تو سوت کو گندم پر ترجیح دیتے ہیں۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ جو اختلاف مغربی اور مشرقی پاکستان میں ہے وہ دراصل زبان کا نہیں چاول کا ہے اور چاول بہشت میں نہیں ملے۔ مگر اب تو نہ چاولوں کا بھگڑا ہے نہ زبان کا اختلاف نہ اس بات کا ہے کہ کراچی مرکز کے نیچے ہو یا مرکز کے اوپر نہ اس

موجوں سے خرد آ رہا ہوئے۔ آخر مارشل لا یا بلکہ دوسری دفعہ آیا۔ ایک طرف تو لوگ خوش ہوئے کہ ایسی باتوں پر جو عام زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اچھا اثر ہوا۔ دوسری طرف اس کے خوشی سے گھبرانے بھی لگے۔ اس لیے حکومت نے کچھ آپ کے کہنے سے کچھ میرے کہنے سے کچھ خود سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ نظام حکومت کے عام شعبوں میں جس قدر پیچان کم ہوگا عوام میں اسی قدر زیادہ اعتماد پیدا ہوگا۔ جب یہ ہوا تو بعض لوگ یہ کہنے لگے کہ یہ تو مارشل لا منہ ہوا مذاق ہوا۔ خوشیوں سے اکثر خراما میں کی گردان رگوں کو بھرست کر رہی ہے۔ چنانچہ میں چار دن ہوئے کسی نے مجھ سے کہا کہ رشت اب بھڑا درداں ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ آپ کے ساتھ کیا کیا جائے۔ کیا آپ میں خودی کا ارتقا دیکھیں نہیں ہوگا؟ کیا آپ سے یہ نہ ہو سکے گا کہ اپنے اخلاق کو حکومت کی مدد کے بغیر ٹھیک دیکھیں میں تو سوچ سوچ کے تھک گیا ہوں اور سوائے اس کے چارہ نہیں دیکھتا کہ پیام مشرق پڑھوں۔ میں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ ان تین اشعار کے علاوہ جن کا میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا میں نے پیام مشرق بھی پڑھا ہے۔ وہ دین شعرو میں بیان کر چکا ہوں۔ شاید آپ نے خیال نہ کیا ہو۔ ایک تو یہ کہ خودی پیدا کر اور خودی سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کوشش ناقص سے زندگی کی جگہ ہے اور تیسرے یہ کہ زندگی کی مشکلات سے مری یا ایبٹ آباد یا لاہور کی طرف نہ بھاگو۔ میں آپ کو کسی خاص امتحان میں جتنا نہیں کر رہا ہوں آپ میں سے ہر ایک کے لیے یہ ممکن ہے کہ ان پر عمل کر کے پہلے اپنی ذات کو بھرقو کم کھاد پہنچائے۔ مختصر یہ کہ جہاں جہاں آپ ہیں کوشش سے "صحت" سے اور دیانت داری سے ترقی کر سکتے ہیں۔ ایک ایک قطرہ کے دریا یا نیاں جاتا ہے جس سے پورا ملک سیراب ہو سکتا ہے اور باہر سے پانی لانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

صاحبان! میں بھرے دہلی کا ہنگامہ ہوا ہوں۔ میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ میں نے "پیام مشرق" پڑھی ہے مگر اس کتاب کو موٹا ہاتھ نہ دلنے لگا۔ گوارا نہ کیا کیونکہ پیغام نہایت مراد ہے (اس بات پر کہیں خواجہ تھیں مجھ سے بد زبان نہ ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تذکرہ و تالیف کے جھگڑے میں اکثر جھگڑا رہتا ہوں۔ کتابوں کی فہمائش میں جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں ایک اردو ڈاکٹری نظریے کی زبانی۔ میں نے گھول کر کبھی تو فی ڈیوڈی کا لفظ سنا ہے۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ فی ڈیوڈی سے کیا مراد ہے بلکہ اس ڈیوڈی ازم میں یعنی تعمیر و تخریب کا کلمہ۔ بریکٹوں میں لکھا تھا "موٹ" یعنی فی ڈیوڈی کا لفظ موٹ کے سینے میں استعمال ہوتا ہے۔ میں نے کہا چلو خیر ہوئی کہ یہ جھگڑا بھی موٹ ہے۔ اگر مذکر ہوتا تو یہ لوگ نہ جانے کیا کر گزرتے۔ ہاں تو ذکر تھا "پیام مشرق" کا۔ اس کتاب کے مطالعے سے خیر و شر اور خدا و قدر کے بہت سے تاریک گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔ اردو میں تو اقبال نے یہ کہا تھا کہ کبھی کبھی خدا بندے سے خود پا چھتا ہے کہ بتا میری رضا کیا ہے۔ لیکن پیام مشرق پڑھنے کے بعد تو یہ معلوم ہوتا

ساڈے خواباں وچ آیا کرو بزم اقبال

صاحبِ صدر!

ایم اقبال سے بہت پہلے آپ کے نیکر لڑی نے مجھے بذریعہ دعوت دی کہ اگر میں کا نوکیشن ایڈریس کے لیے اطلاع دے رہا ہوں تو اس کے بعد اسی شام کو مجلس اقبال میں تقریر کروں اور گیارہ بجے رات فارغ ہو کر واپس لاہور بھی چلا جاؤں اور صبح بائیس گھنٹے میں مقدموں کے فیصلے بھی کروں۔ یہ آخری بات تو غالباً انہوں نے مجھ پر چھوڑ دی تھی مگر میں ان کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ جانتے تھے (آخر انہوں نے میری تصویر تو دیکھی ہوگی) کہ اتنی کارگزاری کے بعد میں واپس جانے کے قابل تو کیا یہاں رہنے کے قابل بھی نہیں رہوں گا اور وہ میری یادگار نکلیں نہ کہیں بنا دیں گے۔ آج کل یادگاروں کے دن ہیں۔ سنا ہے اب پاکستان کی یادگار بننے کو ہے جیسے آپ خود کم یادگار رہوں۔ جیسے آپ کی کاروباری دیانت داری بھانے خود ایک یادگار نہ ہو۔ مگر سنا ہے کہ آپ مجسوں سے گھبراتے ہیں کیونکہ بہت پرستی دین احمدیہ میں کہیں نہیں آئی۔ جہاں بہت دیکھا آپ نے توڑ دیا خواہ لائرس جیسے ایک دل فحش کا ہی کیوں نہ ہو۔ دو تھوڑا چھوڑا کر آپ نے یہ مصرعہ نہیں پڑھا۔ "اس لیے تصویر جاناں ہم نے کچھ نہائی نہیں"

ورنہ تصویروں کا کیا حال ہوتا۔ اب تو آپ اخباروں اور رسالوں کو تصویروں سے زینت دے سکتے ہیں اور خوب دیتے ہیں حالانکہ یہ بدعت ہے۔ آپ میں سے جو لوگ زیادہ دیندار ہیں وہ تصویر میں شکل کو ذرا نیچے حاکم دیتے ہیں یعنی ہکا ڈھکے ہیں تاکہ نقل کفر نہ ہو جائے مثلاً سر کو طہارے کی طرح بناتے ہیں اور تاٹوں کی بجائے ٹکڑی کے ڈنڈے لگاتے ہیں۔ اس کو کارٹون کہتے ہیں۔ ایک دفعہ میرے ساتھ کسی کسی رسالے نے یہ سلوک کیا تھا۔ کارٹون دیکھ کر جب ایک خاتون نے مجھے خط لکھا تو میں نے بہت جلد و تکرار ضروری کام چھوڑ کر ان کو جواب دیا کہ میں دیکھنے میں اتنا برا نہیں ہوں مگر تصویر کی کیا بات ہے۔ ایک خاتون نے تصویر نہیں دیکھی تھی۔ انہوں نے جب مجھے دیکھا تو بے ساختہ کہا کہ آپ کی تقریروں سے جو تاڑ کا تم کیا تھا وہ پکھا تھا۔ میں نے کہا مجھے کچھ کر لوگوں کو مایوسی ہوتی ہے مگر حسن تو آپ کے لیے ہے۔ میرے لیے آپ کا حسن محض کافی ہے۔ مگر میں مجسوں کا ذکر کر رہا تھا اور یہ

بات کا کہ ایک اینٹ اچھا ہے یا چار۔ آپ لڑتے بھی ہیں تو کن باتوں پر۔ مگر اب تو
"اقبال میرے عشق نے سب مل دیے نکال"
(سامعین کے قبضوں اور تالیوں کی وجہ سے دوسرا مصرعہ پڑھنے کی نوبت نہیں آئی)



کہ بت پرستی حرام ہے اور بت شکنی حلال۔ البتہ آئی فراخ دلی ہم میں ضرور ہے کہ یہ حال و حرام کا سلسلہ صرف پتھر کے جوں تک محدود رہتا ہے۔ پانی ہمارے بت بھی ہیں اور بت خانے بھی اور ان کی بچاؤ ہمیں کسی اہل شرع نے اعتراض نہیں کیا بشرطیکہ اس پر اللہ کا نام پڑھا گیا جائے۔ ”کچا کہو ان اسے برہمن برادرانہ نام“

ایک دفعہ میرے ایک دوست کے پاس کوئی ٹھیکیدار بچل کا ایک نوکر لایا میرے دوست میں یہ کمزوری تھی کہ کسی کی دل شکنی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مسلمان کے لیے یہی کافی ہے کہ بت شکن ہو لیں کیوں بنے۔ مگر ساتھ ہی مجھ سے یہ چھاپا ”یہ حرام تو نہیں ہے۔ ٹھیکو تو مجھے کسی کو بتایا تھا۔ اتفاق سے اسی کو دے دیا۔ اور اس کے علاوہ میں نے مسئلہ سنا ہے کہ کسی چیز پر فلک ہو تو اس پر ہم اللہ پڑھا کر۔“ میں نے کہا ”وہ ٹھیکیدار تو اسے خدا کے نام پر نہیں لایا تھا تمہارے نام پر لایا تھا۔ ایسی ٹھیکوک چیزیں خود نہ کھا یا کرو۔ اللہ کے نام پر کسی قرعہ دوست کو دے دیا کرو۔“ اس وقت میں ان کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔

القصہ بیکراری صاحب کو میں نے لکھا کہ میں تو باؤمی میں آؤں گا۔ اور اقبال پر مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ دو سال پہلے کہ چکا ہوں۔ اس خط پر اطلاع ریش سکوت طاری ہو گیا اور میں آرام سے زندگی بسر کرنے لگا۔ مگر آنے سے دو دن پہلے صاحب صدر نے بھی اللہ کا نام لے کر ایک حیرت انگیز خط جس سے میں ہال ہال چلا گیا۔ میں نے ان کو لکھا کہ آپ نے اتنی دیر سے حیرت انگیز خط لکھا ہے کہ طبیعت میں جولانی تو نہیں آ سکتی البتہ جنش میں ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ لکھا انہوں نے یہ تھا کہ آپ نے دو سال پہلے چاہے جس اقبال کے متعلق کی جس وقت وہ لوگ بھول گئے ہوں گے۔ تو گویا حافظہ دو سال تک کہاں رہ سکتا ہے آپ وہی پرانی باتیں بتائی تھیں کہ کچھ تو بچتے۔ اس لیے اسے دوستو اور برہمنوں میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ برادرانہ نام اور اقبال کے لیے کوئی نیا شوالہ بناؤ کیونکہ ”تیرے منم کدوں کے بت ہو گئے پرانے“

اور یہ جو آپ کے حافظے کے متعلق صاحب صدر نے رائے دی ہے میں یہ تو نہیں چاہتا کہ آپ کو ان کے خلاف بھڑکاؤں مگر یہ ان لوگوں کے متعلق کہا جاتا ہے جن کا حافظہ بوسیدہ ہو یعنی اس میں بوسہ میرا اور جو چھلکے واقعات کو بھول جاتے ہیں جیسے کسی عالم یا نااہل کے صہ حکومت میں آپ دعا کریں کہ الہی اس مرتبہ میں معاف کرو۔ آئندہ کبھی اس کو دہشت نہیں دیں گے۔ پھر پانچ سال تو کیا دو سال بعد جب نئے انتخابات ہوتے ہیں بشرطیکہ رہائی عرصہ میں وہ کم از کم ایک سال حکومت کے مخالف کرو میں رہا ہو تو وہ آپ کے سامنے منظم چہرہ لے کر کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تو صرف دس چائے کے جرمن کو اپنے دھڑوں کے کہنے پر چھوڑ دیا تھا۔ میرے بعد ایک سال میں بھی اس آدی چھوڑے گئے اور یہ ان کے علاوہ تھے جو پاکستان ڈے اور ایم بھور یہ

اور ایم نساں پر چھوڑے گئے۔ ایم نساں کا ٹھیکہ ظم نہیں کرتا یا جاتا ہے یا نہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ تین سو تینہ دنوں میں ایک بھی ایم نساں نہ دواور اگر یہ تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کی خوشی میں قید سے لوگ آزاد نہ کیے جائیں۔ میں یہ چہت ہوں ”چھلے پھر کسی آپ مجھے جلدی ہے۔“

میں نے لاہور میں کہا تھا کہ اقبال کے میں نے تین شعر یاد کیے ہیں اور اگر یاد رہا تو سنا بھی دوں گا۔ یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔ اب تو وہ تین شعر بھی یاد نہیں رہے۔ مگر کسی نے یاد دلا کہ لاہور میں میں نے صرف ایک ہی مصرع پڑھا تھا۔ دوسرا مصرع پڑھنے کا موقع آج آیا ہے۔ بات یوں ہوئی کہ میں اپنے سامعین سے کہہ رہا تھا کہ آپ نے ملک میں ہر قسم کے معاملے کو حل کر دیے ہیں۔ کبھی یہ کہ چاول بنگال میں کیوں زیادہ ہوتے ہیں کبھی یہ کہ بنگالی یہاں کیوں نہیں ہوتی، کبھی یہ کہ ہماری قومی زبان ایک کیوں نہ ہو اور ایک بھی وہ جسے بولتے ہیں گراپ تو یہ عالم ہے ”اقبال تیرے شوق نے سب بل دے نکال“

بس انتہائی کہنے لپا تھا کہ لوگ اختیار کی باگ اپنے ہتھکڑوں کے سپرد کر کے بٹنہ لگے اور مجھے موقعہ نہیں دیا کہ دوسرا مصرع پڑھوں اور میں کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کے بعد کسی نے نہیں پوچھا کہ دوسرا مصرع کیا ہے۔ مجھے اس دن معلوم ہوا کہ لاہور کے لوگ سکتے ہو شیار ہیں۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ میں دوسرا مصرع پڑھنے والا ہوں۔ مگر چونکہ آپ لاہور کی ہو شیار سے 87 میل ادھر ہیں میں بتائے دیتا ہوں ”مدت سے آزار دہی کر سیدھا کرے کوئی“

یہ سوال تو مجھے لاہور میں کرنا چاہیے تھا کیونکہ وہاں موقعہ نہیں ملتا اس لیے مناسب یہ ہوا کہ آپ سی سے یہ چھلوں۔ اب جو میں یہ پچھنے کا موقع ہوتا ہے کہ جب وقت جس سوال سامنے آگئے ہیں اور سوال یہ ہے کہ کون سا سوال پہلے کروں۔ کیا پہلے یہ پوچھوں کہ کچا کچا آپ کے شل سب کے سب لکل گئے ہیں یا یو پی بھانڈ کرتے ہیں۔ اسے برہمنوں اگر برادرانہ نام تو مجھے آپ پر فلک ہے کیونکہ جن موتوں کی آپ پر تیش کرتے ہیں وہ تو بھڑکی طرح ملت ہیں ان کے شل کیسے لکل گئے ہیں اور اسی مناسب سے آپ کے نظریے بھی ملت ہیں جن میں خاص اور احمد کے جن میں لپک نہیں ہوتی اور ان کے شل نہیں تو وہ ٹوٹ جاتے ہیں بدل نہیں سکتے۔ اگر آپ اپنے نظریوں میں بحث اور اصلاح کی کوشش کریں تو کیا مضائقہ ہے دیکھیں بھڑکی تو خراشے جاتے ہیں۔

یہ پہلے یہ پوچھوں کہ اگر مل گئے ہیں تو کیا اس نرم جذبے کے تحت جو عفت سے پیدا ہوتا ہے یا خوف و ہراس کی مجبوری سے۔ میرے ایک دو باری کارل میں دھوبی نے بہت لٹا ست لگا دیا تھا جسے اس کی برادری میں کلف کہا جاتا ہے ہر باری کارل سے میری مراد وہ سخت کارل ہے جس میں جون کے بیٹے میں بھی پہننا پڑتا ہے تاکہ گردن سیدھی رہے۔ ایک دن مجھے زیادہ تعظیف ہونے لگی تو کارل

شاعر کی فوا مرود و افرود و بے ذوق انکار میں سرست نہ غنایہ نہ عید

اور وہ ملک مجھے اس طرح ہوا کہ صاحب صدر نے برسوں یا اترسوں یا نرسوں ٹیلیفون کیا۔ یہ اترسوں اور نرسوں کا فرق مجھے برسوں میں معلوم نہ ہو سکا۔ سہر حال کوئی دن تو ہو گا جب انہوں نے ٹیلیفون کیا اور سب سے پہلے یہ پوچھا "خان صاحب کیا حال ہے آپ کا؟" مجھے ابھی تک کسی نے خان صاحب نہیں کہا تھا سوائے ایک سٹیشن شیج کے جو خان صاحب اس لیے کہتا تھا کہ میں اسے چوہڑی صاحب کہوں۔ لہذا مجھ پر ایک غیر معمولی ہنڈ بے جس کو آپ ہنڈ بے غنایت کہتے ہیں مل گئی تھی۔ یہ ہنڈ بے پر پانچا کیونکہ یاد آ یا کہ خاں صاحب پانچوں کو بھی کہتے ہیں۔ میں سمجھا کہ صاحب صدر کسی تلخ آدمی کو ٹیلیفون کر رہے ہیں۔ اس لیے میں نے پوچھا "کون سے خان صاحب؟" آپ کون صاحب ہیں؟ میں نے بدلے کے طور پر کہا تھا کیونکہ خان صاحب اور کون صاحب میں زیادہ فرق نہیں۔ وہ بولے "میں ہوں محمد منور۔ آپ پوچھنے لگا کہ ٹیلیفون والے سنا ہے بڑے نام پر دو آدمی کی بجائے تین آئے پانچ کریں تو بے جا نہ ہوگا؟ اور کس قدر مشکل سے بولا جا رہا ہے۔ ایسے نیکش ناموں کی وجہ سے ہی تو ٹیلیفون کے تار کند ہو جاتے ہیں اور بات سنائی نہیں دیتی اور پھر آپرے پڑے کہتے ہیں کہ بھائی پیسے تو آپ اتنے ہی پانچ کریں گے مگر سنا میں نے کچھ بھی نہیں۔ اور وہ اپنی سرکار پر مدداری ڈالتا ہے کہ لوڈ بند کیا۔ مگر سرکار کا لوڈ ہمیشہ سے زیادہ تھا سرکار بے مل گئی تھی۔ اور سرکار کا لوڈ گھٹانے کے لیے آپ غریب خود ٹیلیفون پر بھی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ خاص طور پر اس وقت جب مدرگمیں نہ ہوں۔ تو ہاں میں نے یہ تو کہیں نہ چاہا کہ ایک شخص کا نام محمد منور تھا اور اس سے کسی شاعر نے کسی ماہی۔ اس نے قیت کے طور پر ایک ایسے شعر کی فرمائش کی جس میں اس کا نام بھی آئے۔ شاعر نے کہا "عالم ہمدردی است و محمد منور"

مگر یہ محمد منور نہ تو کلمے میں آتا ہے نہ روایت میں۔ میں نے بہت کوشش کی مگر صرف ایک ضعیف سا مترادف حاصل ہوا۔ "ترے دم سے بزم اقبال قائم۔ محمد منور" دوسرا مصرعہ جدید اردو میں لکھا ہے۔ "ترے خاں صاحب کا ہو خان صاحب۔ محمد منور" یعنی خدا غارت کرے میرے خان صاحب کو "جیسے کہتا ہے کوئی حیرت انگیز"

ان دونوں مصرعوں کے کسی حصے میں ضرور کسی کی تاریخ و قات لگنے کی۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔ آرام سے دیکھ لیجئے گا۔ اب میں بھرستی کردار کی طرف رجوع کرتا ہوں اقبال نے بعد میں سوچا کہ اگر مصوفی اور شاہ شاعر تین جانش ہونگے تو صرف محمد منور مجھے کہاں تک بچا میں گس لیے فیوں نے سارا قصور اپنے ذمے لے لیا۔ یہ تو نہ کہا کہ میں کردار سے عاری ہوں مگر یہ ضرور کہا کہ

اتار کے پانی میں بھگو دیا۔ آخر گردن تک سیدھی رنگی جا سکتی ہے۔ خصوصاً جب کہ اور سب کچھ لیزا ہوا جیسے عریضیام نے کہا تھا کہ "صدکارنگی کہ گردن زدنی است" یعنی سو کام ایسے کرتے ہو جن کے سبب تمہاری گردن اڑا دینی جا سکتے ہیں۔ اس نے شاید کچھ اور کہا تھا جو بے کی تلاوی کے سلسلے میں تھا۔ "صدکارنگی کہ سے غلام است آں را"

مگر بعض شعر لوگوں نے بدل دیے ہیں کیونکہ سے کچھ ایسی بری چیز نہیں رہی بشرطیکہ وہ کسی نہ ہو اور کلب میں بی جائے۔ الغرض وہ کارنگی کے زیر اثر باطل نرم ہو گیا اور میں نے کہا یہ کارنگتا ہمدرد ہے مگر جب اس کو وہ بارہوا گئی تو سو کہ بھرا کر گیا جس میں یہ سوچتا ہوں کہ آپ کے بل شاید خوف و ہراس کی مجبوری سے لگے ہوں تو مجھے وہ کارنگ یاد آتا ہے جو پانی سے نرم ہو گیا تھا مگر جب مجبوری خود کسی مجبوری سے چلی گئی تو اس کی آواز بھرا کر دیا آگئی۔

یہ پہلے یہ پچھوں کہ آپ کی وہ آواز دھلی پائیں کہ کوئی آپ کو سیدھا کرے مگر اس پر میں نے سوچا کہ انسان پر خود بینی کا اصرار یوں ہی لگایا جاتا ہے۔ زیادہ تر وہ غیر فٹن ہوتا ہے مثلاً ہر ایک ہم میں سے یہی کہتا ہے کہ ضرورت ہے کہ کوئی ان لوگوں کو سیدھا کرے اور وہ خود کو ان لوگوں میں سے نہیں سمجھتا۔ ایک اقبال ہی نے مان لیا کہ اسے خود سیدھا ہونے کی ضرورت تھی۔ مگر اقبال کتنا سیدھا آدمی ہے جہاں کسی جرم کے عاکد ہونے کا احتمال ہو تو وہ خود اقبال کر لیتا ہے تاکہ اسے استغناء کو بھونی شہادت پیش کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ مثلاً ہر موقع پر وہ اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ صرف ہاں میں کافی نہیں کچھ کام بھی کرو چکے کہ دکھاؤ۔ کسی جگہ میں نے ان لوگوں کو نہ کر لیا تھا جو حال مست ہوتے ہیں ان کا بھی کیا ہوگا جو حال مست ہیں۔ اس مقام پر تو بل مست سے حال مست بھر ہیں مگر ان دونوں سے بھر کر دار مست ہیں۔ میں تو کامرست کہتے تھا مگر اس لیے رک گیا کہ کہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ مستی مولو کارنگی وجہ سے ہے۔ اقبال نے کہا ہے۔

مصوفی کی	طریقت میں	فقط مستی	احوال
ما کی	شریعت میں	فقط مستی	کردار
مرد	ہلاد	نظر آتا	فہم کو
ہو جس کے	رنگ و	پے میں	فقط مستی
			کردار

ان دونوں اشعار کے درمیان ایک اور شعر بھی ہے جس کو میں نے اس موقع پر غیر ضروری سمجھا تھا مگر اب کچھ شک سا ہونے لگا ہے کہ صاحب صدر کسی شاعر نے چنانچہ ان کے کلام کے لیے وہ بھی مانتا ہوں۔

خاک شدہ نہیں۔ ابراہیم نے سورج کو طوع ہوتے دیکھ کر کہا کہ یہی خدا ہوگا۔ مگر وہ ڈوب گیا تو کہا خدا ڈوبنے والا تو نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اقبال کی آرزو میں بھی مٹی مٹی نہیں بل کہ مٹی مٹی کے حضور پر نازیدہ سے زیادہ "خاک بدین" تک چلا جاتا ہے۔ وہ بھی انگلیا کیونکہ خدا سے شکوہ کر رہا ہے اور یہ ڈراما سن گیا ہے کہ کتنے فرشتے خدا کے حضور میں اس کی برائی نہ کریں۔ فرشتے اپنی عادت سے مجبور ہیں وہ انسان کی برائی کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہر چند کہ خدا بلند و بالا وجاہے بھر بھی وہ کبھی کبھی فرشتوں کی سن لیتا ہے کیونکہ انہیں ہر وقت قرب حاصل ہے اور مشرقین کا کچھ نہ کچھ پاس تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ انظر اقبال نے جب کہا کہ "خدا و اللہ سے خاک بدین ہے مجھ کو"

تو اس طرح کہا جیسے ہم خط کے اخیر میں لکھتے ہیں آپ کا تابعدار۔ حالانکہ ارادہ ہرگز تابعداری کا نہیں ہوتا اور اقبال کا جسم مٹی کا ہوتا ہوا اس کا خیال ہمیشہ آسمانوں پر پرواز کرتا رہا اور یہی اس کی آرزو کی تعبیر ہے۔

ہر لطف نیا طرز نئی برق جلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

یعنی ہمیشہ کوئی نئی چیز پیدا کرنے کی گمن رہے اور خدا کرے کہ یہ آرزو اور یہ بے قراری بھی قسمی نہ ہو تاکہ جو چیز اب ہے اس سے بہتر وجود میں آسکوں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اور تو ہم کوئی نئی چیز پیدا نہیں کر سکتے ہے یہ پیدا کریں گے۔ مگر ایسا کرنے میں یہ یقینی نہیں ہوتا کہ نیاچہ پہلے سے زیادہ حسین یا زیادہ ڈھون ہوگا۔ اس لیے نئی شادیاں کرتے رہتے ہیں تاکہ مرحلہ شوق کبھی طے نہ ہو۔ اقبال نے شادی کی طرف تو چہنیں کی اور نہ تحقیق کو لیے کے معنوں میں استعمال کیا۔ اس کا آرزو مند انسان تو

آفریدہ کا نکتہ دنگرے
قلب را عقد حیات دنگرے

نئی دنیا پیدا کرتا ہے جو ظاہر کاروں اور امریکہ کی طرف اشارہ ہے جو آج کل آسمانوں کے اعتبار میں مصروف ہیں۔ مگر آپ کو اس کی زحمت کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کے لیے تو نعرہ بھیری کافی ہے۔

مکتبہ لب ب بندہ زہرہ مانگو
کلمہ کہ خیرا نعرہ بھیرم آرزو است

انہوں نے کہا فطرت کے راز جو ہم نے نہیں بتائے ہیں کسی کو نہ بتاؤ۔ میں نے جواب دیا منظور ہے البتہ مجھے نعرہ بھیر لگانے

میں کردار کا غازی نہ بن سکا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کردار کی حد تک وہ غازی تو نہ بن سکے لیکن غازی سے ڈراما کر رہے کا درجہ انہیں حاصل ہو گیا تھا یعنی وہ کردار کے قاضی بن گئے تھے۔ آپ اقبال کو کھٹن کا غازی کہیں یا کردار کا قاضی جو کام قدرت نے اس کے سپرد کیا تھا وہ اس نے بڑی دیانت داری سے پورا کیا۔

اقبال بڑا اپنیٹک ہے من باتوں میں سوہ لیتا ہے
گھٹن کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

اچھا وہ جن سوال جو میں آپ سے پوچھنا چاہتا تھا وہ تو جی رو گئے اور میں شبیر گھٹن رہا اور ابھی تک یہ بھی فیصلہ نہ کر سکا کہ پوچھوں یا نہ پوچھوں۔ اور اگر پوچھوں تو پہلے کون سا سوال پوچھوں۔ جس طرح میر تقی میر نے یہ سوچ کر کہ "سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کیا جاتا"

میر کر لیا تھا میں بھی اسی میں مشغول سمجھتا ہوں کہ یہ سوال ہی نہ کروں اور اگر آپ نے میرے جن سوال سن لیے ہیں تو آپ کی قوت سامعہ نے جلد بازی کی ہے۔ سرکاری طور پر تو وہ ابھی معرض مرض میں نہیں آئے۔ ابھی وہ حضرات کی بستیں میں پراگندہ ہیں۔ اگر آپ کے خیالات اس سے متاثر ہوئے ہوں تو ہونے دیں۔ میں اتنا خود غرض نہیں کہ آپ کے خیالات کو کبھی منسوخ کر دوں۔ البتہ یہ آرزو کا لفظ جو اس مصرعہ میں استعمال ہوا ہے۔ "مدت سے آرزو جی کہ سیدھا کرے کوئی"

وہ ان معنی میں بیان نہیں ہوا جو اقبال کی شاعری کا لب لباب ہیں۔ یہاں تو صرف یہی مراد ہے کہ تم میری بڑے اظہار طعن تھے بلکہ خان صاحب تھے۔ اب ٹینگ ہو جائے یہ ٹینگ کا لفظ میں نے چٹو سے لیا ہے مگر اس کا ترجمہ جس کر سکتا۔ ہاں تو خاص مقامات پر اقبال نے آرزو کو ایسی اونچی کرسی پر رکھا ہے کہ دل بھی چاہتا ہے کہ آرزو پوری ہی نہ ہو اور ناقص رہے اور اس کے حاصل کرنے میں ہی ساری کوشش بلکہ ساری زندگی صرف ہو۔ مثلاً

آرزو ہے خبر از خوشی پ آغوش حیات
چشم واکرد و جهان دگرے پیدا شد

یہ آدم کے پیدا ہونے کے وقت کی بات ہے۔ اس وقت تک دنیا میں کوئی آرزو نہ تھی۔ بس ایک درخت کا پھل کھاتے اور سو جاتے یا پھر کھٹے پھرتے تھے جب زندگی آئی تو اس کی گود بھی آرزو بھی آئی۔ آرزو نے آنکھ کوئی تو ایک دنیا کے لیے کھلایا۔ اب اگر آرزو وہیں قسم ہو جاتی تو زندگی کا چاڑا بے شر رہتا۔ اور آپ ابھی طرح سے سمجھ لیں کہ اقبال کی آرزو کیا ہے "مے بسا آرزو کہ

صدر سے صرف آدھ گھنٹے کی مع غرضی کی اجازت لی ہے اور ضروری نہیں کہ وہ اقبال کے حلقہ ہو۔ اگر آپ مجھے پہلے کہئے کہ ہم اقبال کے چند دن بعد بھی ردالسنس کے طریقے سے ہم اقبال واپس ہو سکتا ہے تو میں اخبار والوں سے کہتا کہ "حقین کا لوایک سرفی" علامہ اقبال الاعلیٰ رحمتہ اللہ علیہ اور اقبال کے حلقہ ایسا پھر کتنا ہو الطیفہ سنا کہ اقبال نے خود بھی نہ سنا ہو۔ اب تو اس کے حلقہ آپ نے اتنا کہا سنا ہے کہ سوائے ابو ہریرہ کے حق کے اور کچھ ہاں نہیں اور کچھ رہا ہے تو یا تو وہ لطیفہ ہیں جو مجھ جیسے لوگوں کو معلوم ہیں جن کے سامنے وہاں ڈھیسے ڈھیسے تھے اور جو مرتے دم تک ان کو قیام پاکستان کے بارے میں رائے دیتے رہے (لیکن جہاں تک مجھے یاد رہتا ہے میری طاقت ان سے ان کی وفات کے بعد ہوئی) یاد و تحذیر میں ہیں جو اقبال کے دہم و گمان میں بھی نہ آتی ہوں گی۔ واصل ایسی تحریروں کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ ان کے بغیر خاطر خواہ طریقے پر دفائی کوئی نہیں ہو سکتی اور اگر دفائی کوئی نہ ہو تو اطمینان نہیں ہوتا کہ واقعی کوئی تحقیق کی گئی ہے مثلاً یہ سنئے۔

"ان تمام حادث سے ثابت ہے ہوا کہ اقبال کا نظریہ حسن معرفت" موضوعیت کا ہے جسے ہم معنوی مناسبت کی بنا پر وحدت جمال کے نام سے موسوم کر رکھے ہیں اور سبکی نظریہ اپنی جگہ پر کج اور جانج بھی ہے۔"

اپنی جگہ تو سب کچھ کچھ ہوتا ہے مگر سب کچھ اپنی جگہ پر رہتا کب ہے۔ حضور کو ساری تکلیف اس وجہ سے پیش آ رہی ہے کہ کسی جگہ تو اقبال کہتا ہے کہ حسن عارضی ہے یعنی اس پر زوال دار ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اللہ میاں کے ساتھ اچھا خاصا مہر کہ ہوا۔ عروج دے کر گرا اور خدا کی پرانی عادت ہے۔ چنانچہ اللہ حسن بھی زوال کا شکار ہوا۔ لیکن چونکہ خدا خود جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے اس لیے حسن نے شکایت کی جسارت کی۔

خدا سے حسن نے ایک روز یہ سوال کیا

جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لا زوال کیا

خدا نے جو جواب دیا وہ پھر کسی دن سناؤ گا۔ بات یہ ہے کہ وہ جواب خود میری کچھ میں بھی نہیں آیا۔ اگر بار خاطر نہ ہو تو معروضات اور موضوعات کے دھوئیں میں اپنا مطلب بظاہر آشکار کر کے چھپا سکتا ہوں۔ لہذا بتائے دیتا ہوں تاکہ آپ کی حسنین راحیں سے قراری میں نہ گزریں۔ خدا نے جواب دیا کہ چونکہ دنیا کی موجودگی کھیر سے ہوئی ہے لہذا "وہی جس سے حقیقت زوال ہو جیسی"۔

اسی طرح کے جواب ہمارے ایک پروفیسر بھی دیا کرتے تھے۔ اگر ان سے آپ پوچھتے کہ معروضات کیا ہیں تو وہ کہتے

کی اجازت ہونی چاہیے۔ یہ اجازت مل گئی اور اب آپ آرام سے نعرے لگاتے ہیں اور فطرت کے اسرار بے نقاب کرنے کا کام آپ نے روئ اور مریکہ کے سپر ریکارڈ یا ہے یہ سب آپ کی تن آسانی کا نتیجہ ہے ورنہ اقبال تو یہ چاہتا تھا کہ فطرت کے راز نہ صرف افشا کیے جائیں بلکہ ان پر اضافہ کیا جائے۔

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

مگر جو کچھ کرنا ہو وہ اس طرح کر کہ اس میں ایک دلولہ نظر آئے اس میں تڑپ پیدا ہو۔ جیسے کھوئی ہوئی چیز کو حاصل کرنے کی بے قراری ہو۔ اس کام کے لیے وہ جسم کو چھوڑ کر روح کو مامور کرتا ہے کیونکہ جسم روح کے زور سے چلتا ہے۔

روح کو یقین کسی غم کششے کی ہے ہوں
ورنہ اس صحرا میں کیوں ٹالاں ہے یہ مثل جس
حسن کے اب عام جلوے میں بھی یہ بے تابلی ہے
زندگی اس کی مثال مای بے آب ہے

مفسرین کے کہنے کے مطابق غم کششے سے محروک نہ ہوا اور اس لیے مجھے کوئی جھنگ چھوڑی یا آموں کا باغ یا رہائشی مکان میں بھی ایک گائے گوردا سپور میں چھوڑ آیا تھا۔ بعد میں وہاں کے ناظر نے لکھا کہ وہ طفلانی میں بہہ گئی ہے۔ یہاں سے ایک ہندو دوست نے جاتے ہوئے اپنی گائے دی کہ یہ کسی قصائی کے ہاتھ لگ جائیگی۔ اس سے تو آپ بہتر ہیں۔ بعد میں جب میں نے سنا کہ گوردا سپور والی گائے طفلانی میں بہہ گئی ہے تو سوچا کہ بہہ کر ادھر ہی اٹھ آئی ہوگی۔ ممکن ہے یہ وہی گائے ہو۔ زیادہ حاصل کرنے سے صرف رنگ بدل گیا ہے اور رفتہ رفتہ جھین ہو گیا کہ یہ وہی گائے ہے کیونکہ وہ بھی وہی سی سی تھا۔ مکان نہ لٹا تو گائے ہی تھی۔ واصل میں بھی اچھا خاصا مہر جا ہوں۔ یہ لوگ تیرہ سال کے کہا جاتے ہیں۔ میں تیرہ سو سال کا لکھا ہوا ہوں۔ اور دادا پر دادا کے وقتوں سے تو باقاعدہ ہجرت کرتا رہا ہوں محض اسلامی جذبے کے تحت یہاں کے لوگوں کو تیرہ سال کا فن سکھانے کی خاطر اپنا سنگار غلک چھوڑ کر بھی کبھی اس طرف چھاپا رہتا تھا۔ پھر یہاں کے دوستوں نے کہا کہ میں رہ جاؤ۔ ہر سال چھاپا رہا نے سے کیا فائدہ۔ ایک ہی سیر حاصل چھاپا رہا۔

مگر میں موضوع سے دور لٹکا جا رہا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ پھر کوئی موقع ہجرت کا نکل آئے گا۔ اس وقت تو میں نے صاحب

ایک دفعہ اقبال اپنے چند احباب کے ساتھ اٹلیج راتے والے تھے مجھ سے اسرار کیا کہ تم بھی ساتھ چلو۔ میں تیار ہو گیا۔ راوی کے اور نواب ذوالفقار علی خاں کی موٹر گزری تھی ہم دونوں چھٹا دروازہ کھولا کر اندر چلے گئے۔ ذرا بعد رکھیا کہ نواب صاحب چلے گئے ہیں اور موٹر چلا دی۔ شاید وہ تک ہم آئے تو اقبال نے کہا ”اٹلیج رچلو“ ذرا بعد نے مڑ کر یہ دیکھا کہ نواب صاحب نہیں ہیں تو زور سے بڑیک لگے گاڑی روک دی۔ ذرا بعد نے کہا ”حضور نواب صاحب تو چھوڑ گئے۔“ اقبال نے کہا ”کوئی جرن نہیں۔ وہ اور سردار جو گندہ رنگہ ساتھ آئیں گے۔“ اس کے چل کر ہم نے دیکھا کہ قلعہ شوچیہ کے قریب سردار جو گندہ رنگہ سکوتر پر جا رہے ہیں۔ ان کو ہم نے ساتھ لیا اور سکوتر سڑک کے کنارے چھوڑ دیا۔ وہ سکوتر کی سواری پر بہت مصر تھے انہوں نے بتایا کہ نواب صاحب دوسری موٹر میں چلے گئے ہیں مگر میں نے ان سے شرط لگا لی ہے کہ میں سکوتر پر ان سے پہلے پہنچوں گا۔ خیر جب موٹر چلنے لگی اور سردار جو گندہ رنگہ کا پیسہ دیکھ کر انہوں نے خوشی میں کہا ”بھئی خاموش گاڑی کے رکبھر آواز کے آگے تیز ہو جاتی ہے اور میرا سکوتر تو بڑا دجال ہے بلکہ خرد دجال ہے۔“ یہ ان کے اپنے الفاظ ہیں۔ میں نے کہا ”یہ خاموشی صرف موٹر پر ہی مقرر نہیں ہو سکتی دیکھا میں تیز رفتار ہیں وہ خاموشی سے کام کرتے ہیں۔“ اس کے اگلے ہی دن اقبال نے یہ شعر سنا ہے۔

کیسے چپے کی بات جو گندہ رنگہ نے کل کہی
موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا شوش
بگمہ آفریں نہیں اس کا خرام ناز
مانند برق تیز مثال صبا شوش
میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پے حصر
ہے جاہ حیات میں ہر چیز پا شوش

آخری شعر میں ”میں نے کہا“ کا ٹکڑا شاعرانہ نازک خیالی ہے۔ دراصل یہ بات میں نے کی تھی۔ چنانچہ میں نے نازک طرے سے اعتراض بھی کیا۔ انہوں نے کہا ”ہم اور تم ایک ہیں“ میں خوش ہو گیا۔ اس بات کا گواہ سردار جو گندہ رنگہ ہے اور اگر آپ نہیں مانتے تو آپ سے پہلے بھی لوگ ایمان نہیں لائے تھے۔ بہر کیف قلعہ اٹلیج کی سڑک سے بھی زیادہ لمبا ہو گیا۔ یہاں دیر سے پہنچے۔ سڑک باؤس میں رات کو آ رام کیا۔ میں بچے رات کو آکھ کھلی تو شہر میں لاؤڈ سپیکروں کا ایک بگمہ بڑا تھا۔ اقبال نے کہا ”کئی ایک گھر کو آگ لگی ہوگی۔“ میں نے کہا ”نہیں بلوہ نہ ہو“ جو گندہ رنگہ نے کہا ”گھر داروہ میں خیرات ہاں رے ہوں

”معرضات! جیسے مرضعات! یہ سارے ایک قسم کے لفظ ہیں۔ واردات، مسامت، آلات و منات۔ ان کو ہم قافیہ الفاظ کہتے ہیں اور معرضات تو آسان ہے۔ جب اس کو معرضیت پر نہیں تو واقعی مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ تو گو یا معرضیت کے معنی ہوئے معرضی کی معنی اور مفعول کے وزن پر ہے۔ یہاں تک تو میں نے بتا دیا ہے۔ اب آپ آگے تم و کشری و کچہ راہنی طیت میں اضافہ کرلو۔“

اللہ میاں نے بھی حسن کو یہی جواب دیا کہ جاؤ اقبال سے پوچھو پھر اقبال کے بعد اس کے مفسرین آئیں گے۔ ساری باتیں پہلے ہی دن میں پوچھا کرتے۔ ازل سے زوال کا کا قطع۔

میں کہہ رہا تھا کہ جناب فقہ کو یہ تکلیف پیش آئی ہے کہ کسی جگہ تو اقبال حسن کو معارضی بتاتا ہے اور کسی جگہ کہتا ہے کہ یہ ہمارے مشاہدے کی بات ہے یا خیالی کی بات ہے جس کو حسین بھیسیں وہ حسین ہے جس کو قحج بھیسیں وہ قحج ہے بعض لوگ سورکا نام نہیں لیتے تاکہ ان کی زبان پلینہ نہ ہو جائے اور اس کو ”بڈرناؤ“ یعنی برا جانور کہتے ہیں اور بعض لوگ اپنے چھوٹے بچوں کو محبت سے ”بگمی“ PIGGY کہتے ہیں جو بگ سے ام تقصیر ہے اور اس طرح اقبال کہتا ہے کہ ”آکھ گردہ کیسے تو ہر قطرے میں ہے طوفان حسن نہ دیکھو تو بس قطرہ ہے“ یا

ہستی و نیستی از دیان و نادیان من
چہ زبان و چہ مکاں شوقی افکار من است

یعنی مجھے کوئی چیز نظر آئے تو وہ ہست ہے نظر نہ آئے تو نیست ہے مگر میں پوچھتا ہوں کہ میری نظر میں خواہ آپ کو سے کی مانند کیوں نہ ہوں آپ کے حسن مطلق پر کیا اثر پڑتا ہے بشرطیکہ آپ عام دنیاوی اعتبار سے ممکن ہوں اور باقی رہی بات زوال حسن کی تو مناسب جواب یہ تھا کہ ”کیا کم ہے یہ شرف کہہ رہے حسن چند سال“

اور اگر دنیا میں بصورتی نہ ہوتی تو پھر سارے لوگ خصوصیت ہوتے اور خوبصورت کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ بات یہ ہے کہ انسان تعمیر کیا جاتا ہے اور جب زیادہ حسن سے اس کی طبیعت آسانی ہے تو بصورتی کی طرف بھی راغب ہو جاتا ہے۔ مگر نہیں سنی آپ نے کہانی اس شخص کی جو ایک چھک رو سے محبت کرتا تھا کسی نے پوچھا کہ یہ جہیں کیسے پسند آیا تو اس نے کہا جب فٹ بال کھیلنے وقت اس کے چہرے کے داغوں میں پیسہ چمکا ہے تو معلوم ہوتا ہے جیسے آسمان حسن پر تار سے چمک رہے ہوں۔ اچھا چھوڑے اس معرضیت اور موضوعیت کے قصے کو چھوڑنا آپ نے مجھے بزم اقبال میں شرکت کے لیے بلایا ہے۔ میں آپ کا اقبال کے بارے میں ایسی باتیں سنا ہوں جو آپ نے پہلے بھی نہ سنی ہوگی۔

بھر کوئی اہل نظر آ جاتا ہے۔ اقبال نے سفید چادر اوڑھی ہوئی تھی اور راجہ حسن اختر اور خواجہ عبدالرحیم ساتھ تھے۔ مجھ سے پوچھا "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔" میں نے کہا "پچھلی یادیں تازہ کر رہا ہوں مگر یہاں کی تہذیبی فضا نے مجھے گلیر کر دیا ہے۔" انہوں نے فرمایا کہ کھڑے اور کبھی کی نظم جو میں نے لکھی تھی وہ آج شام کو پڑھو دل خوش ہو جائے گا۔ اس میں تمہیں اور یہاں کے لوگوں کو ہدایت کا راستہ نظر آئے گا اس لیے اس حکم کی تعمیل میں کچھ حصے پڑھ دیتا ہوں۔ باقی کے لیے دیکھو بانک درامفر-12

اک دن کسی کبھی سے یہ کہنے لگا کھڑا
اس راہ سے ہوتا ہے گزر روز چہرا
لیکن میری کتیا کی نہ جاگی کبھی قسمت
بھولے سے کبھی تم نے یہاں پاؤں نہ رکھا
آؤ جو میرے گھر میں تو عزت ہے یہ میری
وہ سامنے بیڑی ہے جو منظور ہو آئے
کبھی نے سنی بات جو کھڑے کی تو ہوئی
حضرت کسی نادان کو دیکھتے گا یہ دھوکا
اس جال میں کبھی کبھی آنے کی نہیں ہے
جو آپ کی بیڑی پہ چڑھا پھر نہیں اترتا
کھڑے نے کہا آپ مجھ پر یوں ہی کھل کرتی ہیں۔ میں تو محض فی سبیل اللہ مہمان داری کرتا ہوں اور اپنے مہمانوں کو گھر کے
گاہب خانے میں طرح طرح کی چیزیں دکھاتا ہوں۔

لگے ہوئے دروازوں پہ باریک دھن پڑے
دیواروں کو آہنی سے ہے میں نے سجایا
کبھی پھر بھی نہ مانی اور کہا کہ
ان نرم بچھوٹوں سے خدا مجھ کو بچائے
سو جائے کوئی ان پہ تو پھر اٹھ نہیں سکتا

گئے۔ "ہم نے چوکیدار کو بلا کر پوچھا۔ اس نے کہا "مسجدوں میں سرکاری ادا میں دی جا رہی ہیں" ہم نے پوچھا "سرکاری کیسے؟"
کہا "لائسنس دیکھ کر تو گریڈی چیز ہے۔ لاؤ ڈسکری میں سے اذانیں ہو رہی ہیں اور چونکہ ایک وقت پر ہو رہی ہیں اس لیے غل غپاڑہ
ہے۔ اذان تو اصل ہو رہی ہے جو اپنے گنگے کی آواز سے ہو۔ سنا ہے رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے وقت میں ایک خاص موزن تھا جس کی آواز
سارے مدینے میں سنی جاتی تھی۔" اقبال نے ہم سے کہا کہ یہ چوکیدار جال کا ذکر کر رہا ہے۔ پھر وہ دو گھنٹے تک ایک تحویت کے عالم
میں رہے۔ اس کے بعد جال پر شمر کے جو بانک درامے صفحہ 78 پر ہیں۔ جال ایک حبشی نکاح تھا اس لیے اقبال نے کہا "نری
غلامی کے صدقے ہزار آزاہی"

گمر یہ لاؤ سپیکر کا اثر تھا جس سے اقبال سمجھا کہ جال اذان اس لیے نہیں پڑھتا تھا کہ لوگ نماز پڑھیں بلکہ اذان اس کے لیے
اظہارِ عشق کا ایک بہانہ تھی۔ اور موزوں کو دیکھنے جو اذان کو مصنوعی بنا کر اس کا روحانی نغمہ اس کا دلوانہ اس کی ہدایت کو دیتے ہیں۔
لہذا اقبال نے جال کو طلب کر کے کہا۔

اذان ازل سے حیرے عشق کا ترانہ بنی
نماز اس کے نظارے کا اک بھانہ بنی

اگلے دن ہم سیر کرتے ہوئے کھد کے کارخانوں کو دیکھنے گئے۔ اقبال نے کارخانے کے مالکوں کو قہر کے کہا کہ اچھا مال بناؤ
اور کارخانے کی بجائے ٹیکسٹائل بنائو کیونکہ

اجتا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تک
پھنچیاں رومال مظاہرین جاپان سے
اپنی غفلت کی بھی حالت اگر چاقم ری
آئیں گے شال کاشل سے کفن جاپان سے

پھر ان لوگوں نے اتنی ترقی کی کہ اب مزدوروں کے کٹن لایبل ری میں جتنے ہیں۔ مزدور کیا سرکاری طبقے "وسط الحال طبقے اور
عد ہے کہ خود دار طبقے بھی دولت کے جلوے دیکھ کر اپنے روحانی گن گنیں چار کرتے ہیں۔ نیک رات اقبال میرے خواب میں
آئے آپ میرے خوابوں میں بھی لوگ آنے لگے ہیں۔ صرف یہ کہتا ہے کہ رات کو وضو کر کے ایک بیچ اس طرح پڑتا ہوں۔

"مناڑے خواباں دھن آجیا کرؤ"

تو معنی والہ نعم نہ سمجھا تو عجب کیا

ایم اقبال لاہور

آج اس پلٹ فارم پر میں آپ کے سامنے تین سال کے بعد پیش ہو رہا ہوں۔ اس وقت میں نے کہا تھا کہ مجھے اقبال کے صرف تین شعر یاد ہیں، جو کبھی فرصت میں آپ کو سناؤں گا۔ وہ تین شعر میں نے خواجہ عبدالرحیم کے اصرار پر یاد کیے تھے۔ ان سے میں نے کہا تھا کہ اردو میں میں نے کبھی تقریر نہیں کی۔ انہوں نے کہا۔ اچھا انگریزی ہی میں کہی۔ مگر حمید نظامی کا خیال تھا کہ میں اردو لکھ سکتا ہوں۔ لیکن کوئی مٹائی بھی لکھ سکتا ہوں مگر جگ بات یہ ہے کہ بہت دنوں تک میں بیروں کو رہا تھا کہ اس نے کاہرہ و بکھتا رہا۔ یہ تو اب تک آپ کو معلوم ہو ہی چکا ہوگا کہ مذکورہ مونس کے سلسلے میں میں اکوٹھ لکھی کر جاتا ہوں۔ حمید نظامی کو اس وقت تک میں نے نہیں دیکھا تھا۔ عمران کے نام سے میرا حوصلہ بڑھا اور ایک گونہ نصرت کا سوال بھی پیدا ہو گیا تھا چنانچہ میں اردو میں تقریر کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ بڑی جسارت کی بات تھی۔ پھر وہ تقریر حمید نظامی نے اپنے اخبار میں اس طرح بڑھا چڑھا کر شائع کی اور چپکے سے زبان کی غلطیاں اس طرح ٹھیک کر دیں کہ میں ایک پائے کا ادیب بلکہ ادب لطیف بن گیا اور لوگ اپنا کلام اصلاح کے لیے پیچھے لگے۔ وہ سارا کلام میرے پاس رکھا ہے۔ جب میں اپنی اصلاح سے فارغ ہو جاؤں گا تو اس کی اصلاح کی طرف توجہ کروں گا۔

اقبال کا یا کا کمال عظیم کا ذکر کرتے ہوئے مجھے حمید نظامی یاد آتے ہیں۔ کہتے ہیں دنیا عالم حسرت ہے مثلاً اپنے والد کی آخری بیماری میں جب میں تعلیمات گرما کے بعد لاہور آ رہا تھا تو انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ کچھ دن اوٹھ بھر جاؤں اور میں نے ہمدردی کے ساتھ ان کی کورٹ کے کھنکھنے کے وقت چپے چپے جس کی موجودگی ضروری ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کی وفات کے وقت میں ان کے پاس موجود تھا مگر یہ حسرت دل میں ہی رہی کہ ان کی آخری خواہش میں نے پوری نہ کی۔ اسی طرح کی حسرت حمید نظامی کے متعلق ہے مگر وہ ان کی حسرت خیال کی بنا پر ہے۔ جب ایک ایسا آدمی جو اعتدال سے بھی نہ بڑھے مگر اعتدال پر کھڑے ہو کر افق امکان کے لیے پائیاں حد و درود کھائے۔ جو نہ لیڈر بننا چاہے نہ دانش کی ترستار رکھتا ہو نہ صلیبی پروادہ ہمارے درمیان سے اٹھ جائے تو محض ہستی سوتی ہو

اس کے بعد کھڑے نے طریقہ بدلا اور خوشامد کا راستہ اختیار کیا اور کہا رانی اٹھانے میں رجبہ یا ہے بڑا احسن دیا ہے آنکھیں چھاری ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں ہیں سرکشی سے سچا ہے۔

یہ حسن یہ پشاک یہ غولہ یہ ستائی
پھر اس پر قیامت ہے یہ اڑتے ہوئے گنا

کسی نے یہ سنا تو کھینچی اور کہا ہاں یہ باتیں تو مجھ میں ہیں اور بعض دفعہ اس خیال سے بھی کہ کسی کا دل نہ ٹوٹے کھانا بھی قبول کر لیتی ہوں۔

انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں برا میں
جگ یہ ہے کہ دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا
یہ بات کسی اور اڑی اپنی جگہ سے
پاس آئی تو کھڑے نے اچھل کر اسے پکڑا

تو اسے دوستو! میں تو یہ پڑھ کر صبح ہی صبح یہاں سے بھاگ رہا ہوں اور آپ کو خدا اور اس کے کھڑوں کے سپرد کرتا ہوں۔ آپ کو پھر کبھی یاد آؤں تو وہ قطع پڑھ لیا کرو۔

”ساڈے خواہاں وصف آ یا کرو“



جاتی ہے۔ اقبال اور قائد اعظم کے ذکر سے اس طرح میری حسرت تازہ ہو جاتی ہے کہ لوگ جائز طور پر دیکھتے ہیں کہ مجھے ان دونوں سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی ہوگی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ قائد اعظم کو صرف ایک غاصطی سے دیکھا تھا اقبال کو تو دیکھا تک نہیں اور اب یہ کہتا ہوں کہ اسے کاش عید لکھائی ہوگی نہ دیکھا ہوتا اور یہ قصور خواجہ عبدالرحیم کا ہے کیونکہ انہی کے مکان پر عید لکھائی سے ملا تھا۔

خواجہ عبدالرحیم پھر آئے اور کہا کہ ان تین شعروں کو تو تین سال ہو گئے کہ ایک شعر فی سال بھی لکھا جائے تو 121 پریل کو دس بچے تک پچھلا حساب بے باق ہو جائے گا۔ اسے میں تو آپ نے شاید تین اور شعر یاد کر لیے ہوں۔ میرے ایک دوست جب کسی بات پر زور دیتے ہیں تو کہتے ہیں "ایمان اللہ گل ہے کہ ایسی بات نہیں ہوئی۔ میں نے بھی کہا۔ ایمان اللہ بات یہ ہے کہ میں اور کاموں میں مصروف رہا۔ اور اس کے علاوہ آپ نے سنا ہوگا کہ اللہ کے دن لیے ہوتے ہیں اور ایک دن ہزار سال کے برابر ہوتا ہے اور یہ تو اللہ کے دن ہیں لہذا حساب بچاؤ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور پھر اقبال کے شعراں کا تو ہر ایک شعر ایک زندگی ہے کہیں کبھی شام زندگی نہ دو دن زندگی۔ چنانچہ میں اس بات پر تیار ہوں کہ وہ تین شعر دہراتا رہوں اور اس قدر دیر اداں کہ لوگوں کے سارے غل اٹھ جائیں مگر یہاں کا دستور یہ ہے کہ شعراں وقت تک نہ دو ہر لایا جائے جب تک کوئی مکرر پڑھنے کی فرمائش نہ کرے۔

یہ سن کر خواجہ عبدالرحیم نے کہا کہ میں ایک نئی کتاب آپ کے پاس بھیج دوں گا جسے پڑھ کر آپ اقبال پر کچھ اور بھی کہ سکیں گے۔ پھر انہوں نے ایک کی بھانے دو کتابیں بھیج دیں اور ایک پر لکھا کہ میں یہ جتنی بھیج رہا ہوں۔ مگر دوسری کتاب کی دل شکنی کے خیال سے میں نے اس عدم سادات کو رد نہیں کیا اور دونوں کو کھٹا قبول کر لیا جو چار پانچ کتابیں اس کے بعد میں نے خود مانگی ہیں ان کو میں ویسے ہی رکھوں گا۔ کیونکہ کچھ معلوم نہیں ہے کہ میری اور اقبال کی مجموعی یاد آپ کو بھرکرتا ہے یا نہ ہے یا نہ ہے والے تین چار آدمی ہوتے ہیں مگر وہ ایسی جمل جمل چاہتے ہیں کہ یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ اگر میں آپ کے سامنے آتی یا تو آپ مایوس ہو کر شاید خود لکھی کر لیں گے اور اگر آپ نے خود لکھی نہ کی تو وہ پھل آپ کی شرافت ہوگی۔ چنانچہ ایک ایک مہینہ گزار کر لیا لیکن میں نے کوئی کتاب پڑھی نہ دیکھ سکی۔ ان کتابوں میں سے ایک کا نام "جاوید نامہ" تھا جو ایک روحانی سفر ہے جس میں سب سے پہلے اقبال کی روح لکھی ہے اب آپ ہی سوچتے کہ چھٹی کے سینے میں میں زندگی کی سیر کرتا یا انسان کی اور پھر مولانا ہامد کا بہت بڑے بزرگ ہیں مگر دن رات ان کی صحبت میں کون رہے۔ ان کی مثنوی تو فارسی زبان میں قرآن ہے اور کیا پانچ وقت کی نماز کچھ کم ہے یا پانچ وقت بھی

انسان باخبر ہے اور وہ بھی چنٹیوں کے یا م میں وہ مہینہ بھی رزوں کا تھا۔ آدناش کے دن اکیلے نہیں ہوتے اور آدناش بھی ان کے ساتھ آتی ہیں۔ میں یہی کہہ سکتا تھا کہ صبح کی اداں سے صبح کی نماز کچھ جتنے منہ بھی ہوں "جاوید نامہ" نے کر آسان کا سفر کرتا رہوں۔ آسان بھی ایک نہیں تھا۔ روی کی روح سے ملنے کی تار پر واژ شروع ہوئی اور پرواز کے دوران میں وہ وہی پچھلے سال کی پچھلی صدی کی پرانی باتیں سناتے رہے۔ جب انہوں نے کہا۔ "شیر خدا اور رحم دستا غم آرزوست"

تو میں نے عرض کیا "قبلا میں تو حاضر ہوں مگر آپ شاید میرا کوئی اور نام نہ دھوڑ رہے ہیں۔" انہوں نے اس طرح دیکھا جیسے مجھے پچھاننے سے نہ ہوں اور آسان کی بلندیں کو کسر کرتے ہوئے کہا "گفت آگم یافتی نہ خود غم آرزوست"

جس سے اس وقت تو میری خودی ذرا مجروح ہوئی مگر بعد میں اس کا مطلب یہ سمجھ میں آیا کہ اور تلاش کرو اور تلاش کر بھی سائیکس نہ ہو جائے۔ حرکت میں رہو اس لیے میں سر ہلا رہا۔ اس دن ہم آسان سے جلدی اترے کیونکہ مجھے کسی کام سے ایک گاؤں میں جانا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے خیال ہوا کہ اس طرح بے مقصد بھی آسان پر بھی زینت پر پھر باصحت پر برا اثر ڈالے گا۔ اگلے صبح کو جب روی آئے تو میں نے دیکھا کہ پرواز کا اہتمام انہوں نے اقبال کے سپرد کر دیا تھا۔ اس بار ہم اور بھی اونچے اڑے۔ میں نے کہا "قبلا گشتی نہ ہو تو وہاں لے چلے۔" انہوں نے پوچھا "کہاں" میں نے ڈر کے مارے نام نہیں لے سکتا تھا میرا مطلب مقام معراج سے تھا۔ میں نے کہا "کوئی جگہ ہے جس پر ہمیشہ یہ منظر رہتا ہے کہ آدناہرے رسول وہاں جیساں طور پر پہنچتے تھے وہاں کا روحانی سفر کیا تھا۔" روی نے اقبال کی طرف دیکھا اور اقبال نے روی کی طرف اور میں بھی ایک کی طرف دیکھتا بھی دوسری کی طرف۔ روی نے پوچھا "جاوید نامہ میں پڑھا۔" میں نے عرض کیا "پڑھو رہا تھا جب آپ آئے مگر پڑھنے سے یہ باتیں کچھ نہیں آتیں۔" اس پر اقبال نے کہا۔

سجست	معراج	آرزوئے	شاہدے
امتحان	رو	بروئے	شاہدے

یعنی معراج دراصل اس آرزو کی تکمیل ہے کہ کوئی میرے امتحان کا شاہد بنے اور اس بات کی تسلی کرنے کے لیے کہ آپ مردہ ہیں یا زندہ یا جاں برب۔ تین گواہوں کی ضرورت ہے۔ پہلا گواہ ہے اپنا ذاتی شعور جس کے ذریعے سے آپ اپنا تجزیہ کریں۔ دوسرا گواہ ہے دوسرے آدمی کا شعور جس کو آپ نے اس مقصد سے جگا ہوا کہ اس کی روشنی میں آپ اپنی ذات کو دیکھیں۔ تیسرا گواہ ہے ذات حق کا شعور جس کی روشنی میں اگر اپنی ذات کو دیکھ سکیں تو گویا اپنے مقام پر پہنچ گئے کیونکہ

پڑھی ہے جن کا علم ہے پایاں تھا۔ یہاں پشاور میں کیا رکھا ہے۔ پشاور میں ہم دوسری طالب علم ریاضی پڑھتے تھے اور تیسرا امارا پرویسر جو تھوڑی سی ریاضی پڑھا کر گزارا دھڑلے سے لے گیا تھا۔ ایک دن تاج محمد خاں سے میں نے پوچھا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین نے کس طرح ثابت کیا تھا کہ شب فراق بارہ گھنٹے سے زیادہ لمبی ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا یہ تو مجھے پتہ نہیں مگر آخری نتیجہ کیا تھا۔

اقبال کی وہ فلسفیانہ کتاب جب میں نے پڑھی تو تاج محمد خاں یاد آئے۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اقبال کس طرح اس نتیجے پر پہنچے مگر آخری نتیجہ کیا تھا کہ اسلام ایک جاودہ حیات ہے۔ اسلام مل سکتا ہے حقیقت سے منہ نہیں موڑتا۔ حقیقت کی تلاش میں جس قلمی کے ذریعے ان مقامات تک پہنچا ہے جہاں حواسِ فسر کے ذریعے نہیں پہنچ سکتے اور آخری حقیقت کو خدا کہتے ہیں، چونکہ حقیقت کی تلاش انسان کا کام ہے۔ اس لیے مذہبِ زندگی کا ایک ضروری جزو ہے اور اس سب مشکل باتوں کی تشریح دراصل خودی کی ایک تشریح ہے۔

خودی کے قلم پر پہنچ کر میں محسوس کر لیتا تھا کہ پاؤں زمین پر ہیں۔ کیونکہ سراسر خودی تو ہم سے بہتوں کی زبان پر ہے بلکہ اس کے ساتھ بنوادی کے رموز بھی آشکار ہونے لگتے ہیں۔ مجھے کبھی شک ہوا کرتا تھا کہ خدا کا لفظ خودی سے نکلا ہے مگر اب یہ کتاب پڑھ کر تو یقین ہو گیا ہے کہ یہ بات ہے اور بات ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین کے شاگرد کی طرح میں بھی شاید ایک ماہر کا آخری جواب دیکھ کر نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شب فراق کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں ہے پایاں ہیں۔

ان ہے پایاں چیزوں میں سب سے پہلی چیز جس پر اقبال کی نظر پڑتی ہے وہ قرآن ہے۔ اس کے نزدیک قرآن کا بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان میں اس بات کا شعور پیدا کرے کہ اس کے تعلقاتِ خدا سے ایک طرف اور کائنات سے دوسری طرف کیا ہیں۔ اسلام میں حقیقت اور مجاہد دو الفاظِ حق ہیں بلکہ مجاہد کی دوا کی خوش بینی رشتی ہے کہ حقیقت پر روشنی ڈالے اور اس کا پتا حصہ بنالے اور اسی لئے وہ حقیقت کی تلاش مجاہد میں کرتا ہے۔ ”مجھی اسے حقیقتِ شہرِ مجاہد کہاں میں“

یہ نہیں کہنا کہ اسے مجاہد حقیقت کی فصل اختیار کر کے ظاہر ہو۔ اسلام اور مسیحیت میں یہی بنیادی فرق ہے کہ اگرچہ دونوں انسان کی خودی کی آخری منزل روحانیت میں ڈھونڈتے ہیں اسلام مادی دنیا سے گریز نہیں کرتا بلکہ اس کی تعمیر کرنے کی ایسی ہیئت تلاش کرتا ہے جس پر زندگی کی عمارتِ بادلوں میں نہیں بلکہ زمین پر کھڑی کی جاسکے۔ آپ سمجھیں گے کہ میں اپنی بات کرتا رہا ہوں کیونکہ مادی دنیا کی تعمیر مسلمان تو نہیں کر رہے ہیں اور لوگ کر رہے ہیں۔ یہی بات تو اقبال کو بھی چھٹی تھی اس لیے قرآن کی طرف رجوع کیا

بر مقام خود رسیدن زندگی است
ذات ما ہے پندہ دیدن زندگی است
اور اسی لیے ”مصطفیٰ راضی نہ تھا الہٰذا“ ”مصطفیٰ نے کہا کہ میں تو دیکھوں گا اور اس کو ترائی نہیں کہا۔

یہ بات شکیب سے میری کچھ میں تو آئی کیونکہ میں آپ سب کی طرح صفات میں محصور ہوں اور ہر چیز کا ہم صفت ڈھونڈتا پھرتا ہوں اس لیے یہی مناسب سمجھا کہ ”ہم پہ قبلہ“ کہہ کر خاموش ہو رہوں اور اٹھنا کہ یہی کرتا رہوں۔ سب سے پہلے قلمِ قرہ پہنچے۔ آپ نے دیکھا ہوگا۔ جاوید نامہ میں چھ قلم ہیں۔ ان پر آپ کو مختلف لوگوں کی ارواحِ حق ہیں۔ ساتویں آسمان کا ذکر نہیں ہے یہ شاید ان ارواح کے لیے مخصوص رکھا ہے جو اقبال کے بعد آئیں گی۔ ہم بھی امیدوار بن سکتے ہیں۔

اقبال مجھ گئے کہ میں کچھ نہیں سمجھ رہا۔ لہذا رخصت ہوتے وقت انہوں نے خواجہ عبدالرحیم کو آواز دے کر کہا اس ناخروہ کو میری دوا مگر یہ کتاب پڑھاؤ جو میں نے اسلام میں تصور مذہب کے موضوع پر لکھی ہے اور پھر اس خیال سے کہ کہیں خواجہ عبدالرحیم کو کئی قلم کتاب مجھے نے دے دیں اس کے نام کی صراحت بھی کر دی۔

THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM

مگر پرواز سے واپس ہو کر پھر اپنے گاؤں میں پھر نے لگا اور یہ کتاب نہ پڑھی۔ مٹان میں ایک آدمی جاوید پور سے آیا تھا اور صرف مٹان کی خانقاہ کی زیارت کرنے آیا تھا۔ میں بھی خانقاہ میں جا کر وہ کتاب قسویٰ قسویٰ دیر پڑھ لیتا۔ جو کچھ میری کچھ میں آ یا اس کا سبب اب یہ ہے مگر پہلے ڈاکٹر ضیاء الدین کے ایک شاگرد تاج محمد خاں کا قصہ سن لیجئے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین علی گڑھ کے مشہور عالمِ ریاضیات تھے ایک دفعہ جب کلاس میں گئے تو ایک پورے کسی طالب علم کے ہاتھ سے یہ سوال نکلا ہوا پایا۔

”اگرچہ ریاضی دان ہیں تو شب فراق کی لمبائی طے ریاضی کی رو سے ثابت کیجئے۔“

دینی بہت ہے علم ریاضی میں آپ کو
طول شب فراقِ ذرا ناپ دیجئے

ڈاکٹر ضیاء الدین نے باقاعدہ مواصلات کرنا شروع کر دیا۔ ریاضی میں جب کسی چیز کی مدعا قائم نہ ہو سکے تو اس کو ان فی ثقیل کہتے ہیں یعنی انتہائی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے کئی عددوں کو یس گنایا اور ضربِ تقسیم دے کر ثابت کیا کہ شب فراق کا طول ان فی ثقیل کے برابر ہے۔ یعنی ہے پایاں ہے۔ تاج محمد خاں یہ قصہ سنایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ہم نے ایسے استادوں سے ریاضی

تاکر آپ یہ نہ سمجھیں کہ ان کو قہقہے نے خراب کر دیا ہے۔ ”وما خلقنا اسماوات والارض وما صرنا لعین وما خلقنا اللہ الا محرم المؤمنین“ ہم نے زمین اور آسمان کو ایک ٹھیک کے طور پر نہیں بنایا۔ نہ جان چیزوں کو جو ان کے درمیان واقع ہیں۔ ہم نے ان کو حق سے پیدا کیا ہے اقبال نے یہاں ”حق“ کا ترجمہ ”مقتصد“ کیا ہے کیونکہ جب آپ کہیں کہ یہ چیز آپ نے ٹھیک کے لیے نہیں بنائی تو کوئی مقتصد ہوگا۔ اور یہ تو کی جگہ کہا ہے کہ اختلاف شب و روز میں زمین و آسمان کی پیداوار میں رات اور دن کے تسلسل میں سورج اور چاند کی ایک مقررہ مسافت میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو سوچتے ہیں۔ ”وخلقنا فی خلق اسماوات والارض“ اور آسمانوں اور زمین کی پیداوار پر نظر کرتے ہیں اور کہتے ہیں ”ربنا خلقت هذا باطلا“۔ رب ہمارے تو نے یہ چیزیں جو مجھے تو پیدا نہیں کیں اوتو کیا نظر آپ کی جہی ہے کہ تاکر کہہ کر سو جائیں۔ میں ایک کتاب مباحثات کتبوں کا اور یہاں اس میں ضرور رکھوں گا مگر تب تک آپ کو ثواب سے کیوں محروم رکھوں۔ اس لیے واضح ہو کہ جو شخص شب و روز جب چاند چھوڑیں گا وہ صاف آخر سے کپڑے بانٹوں کے بنے ہوئے اور بجلی سے استری شدہ پہنے اور ان پر اوڑھی کولون چمڑے کے اور کوری مولر میں جھڑ کر شالہ مار یا کسی جنگل کا رخ کرے اور ہزار دفعہ کہے کہ اے رب ہمارے تو نے شالہ مار اور بانٹوں کے کپڑے بے فائدہ تو نہیں پیدا کئے تو اس کو ایک ہزار حج اور ڈیڑھ ہزار عمرے کا ثواب ملے گا۔ اس لیے میں بھی رات کو سوئے وقت ”سبحہ اللہ وحمہ والکلیل“ پڑھتا ہوں۔ مگر یہ قصد حق کر کے کہ ہمارے لیے خدای کا فی ہے دن کو سوچنا رہتا ہوں کہ خدا کے سوا اور تو کوئی مجھ سے ناراض نہیں اور خصوصاً دونوں کے دنوں میں خدای کا وکالت رات تک ہی محدود ہے تو بہتر ہے۔

اقبال کہتا ہے اور میں بھی ادب کے ساتھ تائید کرتا ہوں کہ تعلیم قرآن یہ ہے کہ ان چیزوں کی حقیقت فکر ذریعے سے معلوم کرو۔

”وجعل لکم السمع والابصار والافئدة“

جسمیں کان اور آنکھ اور دل دے۔

کانوں سے سنتے ہیں یہ ایک ذریعہ ہے جسمیں علم کا۔ آنکھوں سے آپ دیکھتے ہیں یہ ایک اور ذریعہ ہے جسمیں علم کا۔ دل سے آپ کیا دیکھتے ہیں؟ سوچتے ہیں۔ یہ دیکھتے حواسِ شہ کے علاوہ ایک اور ذریعہ علم کے حاصل کرنے کا پیدا ہوا ایک جہاں سمجھے کہ اس تک دشست سے جن کا علم آگاہان اور دیگر حواسِ فراہم کرتے ہیں کا معمار کوئی اور عمارت کھڑی کر دیتا ہے اور خدا اسی لیے کہتا ہے کہ دل بھی دیا ہے۔

اگر سورج اور چاند کو دیکھ کر آپ کو یہی کرنا تھا کہ اللہ کو ہارک ہادیں کہ تو نے بہت اچھا دستور قائم کیا ہے تاکہ وہ خوش ہو کر ایک اور چاند پیدا کر دے جو لاہور کی بجلیوں کے شراب ہونے پر کام لائے تو پھر بحیثیت ایک غیر جانبدار تماشائی کے مجھے یہ نظر آتا ہے کہ اللہ کی خودی نے تو خدای اختیار کر لی۔ مگر آپ کی خودی گدائی کے جذبے سے آگے نہیں بڑھی۔ اور اگر میں بات حق تو پھر خدا نے کیوں کہا کہ یہ مخلوق بے کار مکمل کے طور پر پیدا نہیں کی ہے۔ پھر کیوں کہا کہ زمین آسمان کو آپ کے لیے مسخر کیا ہے؟ زمین کو مسخر کرنے کے لیے تو یہ حق بھی ہو سکتے ہیں کہ آپ اس میں کھینچ بادی کریں۔ زمین نہایت فرماں برداری سے آپ کو فصل دے گی۔ سورج کی تحفہ آپ کو کس طرح چھپے بیٹے کریں گے؟ یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ دوسرے مینے میں جب غصہ ہو تو آپ سورج کی شاموں سے اپنے بدن کو گرم کر لیں۔ اگر یہ بات آتی تو جس دن دن ہوتے سورج یہ کبہ دیتا کہ آج مجھے بارشوں نے مسخر کر لیا ہے لہذا آپ کی تحفہ کو چھپی ہے اور ایسی تحفہ یعنی دھوپ میں بیٹھنا تو تھوڑے اور گدھے کو بھی میرے۔ مسخر کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ آپ اس کی ساخت پر دانت اس کے ذرات اس کی شامع اس کے شانہ روز اور سالانہ گردشوں کا جائزہ لے سکتے ہیں اور اسی کو سائنس کہتے ہیں۔ گویا سائنس مذہب کا حصہ ہے۔ ایک اور جگہ کہتا ہے۔

”لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم“

یقیناً ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں بنایا۔ ”قم ردنا واصل المسلمین“ یقیناً پھر اس کو پست سے پست کر دیتے ہیں مگر جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں ان کیلئے اجر لاتنا ہی ہے۔ اس کا یہ تو مطلب نہیں ہو سکتا کہ پہلے آپ کو خوش اندام بنایا پھر رویں کر دیا۔ اگر یہ مطلب ہو تو ہونو زنگی کے بنگلے سے صرف ٹھیک تماشائی ہوتے پھر کوئی اور مطلب جو مجھے جو مقصد حیات کے منافی نہ ہو۔ اقبال کہتا ہے کہ جب انسان زندگی پر آ کر ٹھکھوٹا ہے تو دیکھتا ہے کہ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ میرے ارد گرد مضبوط طاقتیں ہیں مگر میرے پاس ایک سوچنے والا دل ہے۔ اس کے ذریعے سے کیوں نہ ان طاقتوں پر قلاب پاؤں۔ کسی اور نے یہ تشریح کی ہے کہ جب انسان اپنے ذہنی امکانات سے کام نہ لے کر موقع ضائع کر دیتا ہے تو گویا پست حالت میں رہ جاتا ہے۔ دونوں باتیں ایک ہیں کیونکہ وہ لوگ پست نہیں رہتے جہاں ایمان لاتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں۔ ایمان تو وہی لائے گا جو قدرت کی نشانیاں دیکھے اور ان پر غور کرے اور ان کو مسخر کر کے کوئی نئی دنیا پیدا کرے اور یہ بھی سوچے کہ یہ باتیں کیوں بار بار دہرائی گئی ہیں۔ اب اس سطرے کی تائید میں ان کا کام سنئے۔ اس دفعہ میں کم از کم دس شعر پڑھوں گا تاکہ آپ کے آئندہ دس سال آرام سے گزر دیں۔

جہاں رنگ و بو فہید نی بہت

آپ کا خیال ہوگا کہ یہ آسان کاراست اختیار کرنا اور ستاروں کے راز حاصل کرنا شاعرانہ ذراک خیالی ہے مگر اب تو آپ پرواضح ہو گیا ہوگا کہ یہ یقیناً قرآنی حکم کی قیید ہے۔ ”پیام شرقی“ میں خدا اور انسان کے درمیان ایک مکالمہ ہے۔ خدا کہتا ہے کہ میں نے سنی اور پانی سے دنیا بنائی اور تو نے اس میں پاکستان اور ہندوستان بنا دیے۔ میں نے لوہا پیدا کیا اور تو نے اس سے شمشیر اور ہندو بنایا دی اور ہال آخر

حجر آفریدی نہال چمن را
قصہ ساختی طائر نقرہ زن را

اگر درشتوں کو کاٹنے کے لیے کھماڑی بنائی اور پرندوں کو قید کرنے کے لیے بنجرہ بنا دیا۔ اللہ میاں کی اس شکایت پر اقبال نے جواب دیا کہ تو نے ہی میرے ارد گرد خاموشی طاقوں کو بچ کر کے نہیں سطر کرنے کا حکم دیا تھا۔ دیکھ کر میں نے کس طرح انہیں مسخر کیا ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفرید
سفال آفریدی اینچ آفرید

”تو نے اندھیری رات پیدا کی میں نے چراغ پیدا کیا تو نے سنی پیدا کی میں نے خوبصورت خیال بنایا۔“

بیلان و کسار و داغ آفرید
خیلیان و گھڑار و باغ آفرید

یعنی جو کچھ مجھے تجھ سے ملا اس کو بھج کر دیا۔

من آئم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آئم کہ از دہر نوحید سازم

میر کو اتنا صاف کرتا ہوں کہ آئینہ بن جاتا ہے۔ اور زہر کو نوشاد بنا دیتا ہوں یہ سب میری خطا کے مطابق ہے اور اسی طرح کمال کو کھینچنے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے ابتدا میں میراج کا ذکر کیا تھا۔ ضرب کلیم میں اقبال نے خود درحاضر کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا ہے چند شعر میراج چاس طرح لکھے ہیں۔

دے دلولہ شوق جسے لذت پرواز

درمی داری ہے گل چھٹی ہست
ولے چشم از دوران خود نہ بندی
کہ در جان تو چڑے دینی ہست

اس رنگ و بوی کو نہیں بھٹتا ہے۔ اس میں گل کے پھول بھی توڑنے ہیں مگر یاد رکھو تمہارے اندر بھی کوئی چڑ ہے۔ اس اندرونی آنکھ کو بند نہ کرنا۔ ان اشعار میں آنکھیں بھی ہیں اور ناک بھی ہے اور دل بھی ہے۔ یہاں کانوں کا ذکر نہیں کیونکہ اکثر لوگ کانوں کے کپکپہ ہوتے ہیں۔

پھر تجھ فطرت کا بات کھولے۔ اس کا پہلا حصہ ہے سلاوا دوم۔

نفرہ زد عشق کہ خویش بگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
خبرے رفت ز گردوں یہ شہستان ازل
عذرے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

اب ایک صاحب نظر پیدا ہو گیا ہے وہ کائنات کے حسن کا جائزہ لے گا وہ اس پر غور کرے گا۔ وہ تحقیق کے رازوں کو بے نقاب کرے گا۔ مختصر یہ کہ سائنس اور فلسفہ رائج ہوگا۔ سکول اور کالج پھیل گئے۔ یونیورسٹی کا سنگ و تار کھانچا گئے۔

زندگی گفت کہ در خاک مجید ہر عمر
تا ازین گنبد ویرینہ درے پیدا شد

زندگی جو مٹی میں اسیر تھی اب حرکت میں آئی۔ اب کھن دروازہ کھلا اور کسی دیکھنے والے نے ہمارا کلا۔ اب ضرور کچھ درد و نشاط کے نغمے بلند ہوں گے۔

”زندگی سوز و ساز پہ سکون دوام“

اور

”چہ خوش است زندگی را ہر سوز و ساز کردن“

زندگی میں سوز پیدا کرنا اس میں سنا پیدا کرنا بلکہ ہو سکے تو ہوائی جہاز بھی۔ ”رواں سانس نورانی پرستار و راز کردن“

ہے جو عجمی کے سوال میں ایسا بدل کیا ہے کہ اگر آج صلاح الدین پھر زندہ ہو تو وہ آپ کو پہچان ہی نہ سکے گا۔ آپ دیکھنا آئندہ میں دیکھا کریں کہ جب سے آپ آزاد ہوئے ہیں ضمیر کا کوئی حصہ واپس آیا ہے یا نہیں۔ اقبال کے مطابق تقدیر ہے تو کی مگر وہ چیز جو تاک میں رہتی ہے کہ اگر آپ کا مل ذرا کند ہو جائے تو اپنی دور دھاری گوارا آپ کے سر پر مارے۔

ہر لکھ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی
ہر صفت تہی دو بیکہ نظر اس کی

رحمت ہونے سے پہلے آپ سے یہ الفاظ ہیں کہ اسلام اور تقدیر اور اجتہاد کے حلقوں میں نے جو کچھ کہا ہے وہ میری رائے نہیں۔ میں نے اقبال کی رائے پیش کی ہے۔ البتہ نہایت ادب سے تائید کرتا ہوں اور جہاں کہیں اس میں تکب معاملہ ہے وہ فقیر کا حصہ سمجھیے مگر اس سے آپ ناراض نہ ہوں۔ پیش مقرب سے تو میں اپنا مقابلہ کرنے کی تاب نہیں رکھتا مگر پیش مقرب کی طرح میری طبیعت کا یہ مٹھتی ہے اور میں کیا کروں یہی میری تقدیر ہے۔ خواجہ حافظ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر مسلمان یہی ہے جو حافظ رکھتا ہے تو اسے ہر حال ماکہ آج کے بعد کل کا دن بھی آئے گا۔

گر مسلمان ہیں است کہ حافظ دارد
وائے گرہیں امروز بود فردائے

قاضی خیر کو معلوم ہوا اس نے حافظ کو بلا یا یا مرتد ہونے کا فیصلہ غیر حاضری میں دے دیا۔ ان دنوں قاضی زیادہ اختیار کے مالک تھے۔ بہر حال حافظ نے فوراً دوسرے اور اسناد فرکر کے مسلمان کی تو جین کسی جیسا کی کے ذمہ ڈال دی۔

ابن حنیم چہ خوش آمد کہ سر گاہی گفت
بر در میکدہ پادشاه و نے ترسائے
گر مسلمان ہیں است کہ حافظ دارد
وائے گرہیں امروز بود فردائے

تو میں بھی یہ مسلمان اقبال کے ذمہ لگا ہوں۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض کرنا ہو تو خط میرے نام نہ بھیجیں خواجہ عبدالرحیم کے نام نہ بھیجیں۔



ہمارے ابتدائی عالم زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ ایک رو بہ ترقی تمدن کی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر زور دھار سے دماغ سوزی کرتے رہے۔ پھر تین صدیوں کے بعد تمدن تو بڑھنے سے نہ رکھا نہ پگڑیاں لگا دیں اس میں اب نہ موڑ کا ذکر ہے نہ ہوائی جہاز کا۔ اور آپ نے اگر ملامتھان میں لاہور سے پشاور جانا ہو تو چونکہ فاصلہ انگلیں میل سے زیادہ ہے اس لیے آپ روزہ رکھ کر ہوائی جہاز میں سفر نہیں کر سکتے۔ اقبال پوچھتا ہے کیا ان آئندہ نے خود بھی کبھی یہ دھڑکی کیا تھا کہ تیسری صدی ہجری کے آخری سال کے آخری دن کے بعد اجتہاد ختم ہو جائے گا اور وہ امانت بھی واپس ہو جائے گی جو انسان کو اپنے پیدا کرنے والے سے قحیٰ میں۔ غالب اس لیے غم ہو جائے گی کہ انسان عالم اور جاہل ہے اور چونکہ ہم اب عالم اور جاہل ہو گئے ہیں اس لیے یہ امانت اہل فرنگ کے پاس چھوڑ دی جائے۔ کچھ ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ ایک کتاب کے بعد سائنس اور ریاضی جیسے علم عرب کو چھوڑ کر سپانیا کے راستے افریقہ گئے ہیں اور ہم میں سے بعض امام جماعت بنے۔ بعض نے چار شاہیاں کر لیں اور جوتی رہے وہ تقدیر کی کتاب لے کر قادیان کر کے رہے۔ اس کو پڑھتے ہیں ان پر رشک کے خلاف چڑھا دیتے ہیں۔ میں نے اس قسم کے ایک روشنی خلاف میں جلدیں کتاب دیکھی۔ لباس بنا دیا تو بیکہ قرآن لکھا جس کو آپ کبھی بھی پڑھ بھی لیتے ہیں۔ میں نے جب سے کہا یہ تو قرآن ہے۔ اس کتاب والے نے کہا مگر اقبال کہتا ہے کہ یہ تو کتاب تقدیر ہے۔

ای قرآن میں ہے اب ترک جہاں کی تقصیر
جس نے مومن کو بتایا مہ و پروین کا امیر
نہ پ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
حق جہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
قفا جو تا خوب بدترج وی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

تو صاحبان! اس طرح تو میں مانا ہوں کہ قرآن کتاب تقدیر ہے بشرطیکہ آپ یہ کہیں کہ اسی سے ہم نے اپنی تقدیر بنائی ہے۔ اور خدا کی تقدیر کا ہمارے ارادوں میں نہیں ہوتا اس طرح سے جیسے خون کی جگہ ہماری رگوں میں نوا درگوش کرتا ہوا اور تیسری بات ضمیر کی ہے جو غلامی میں بدل جاتا ہے۔ آپ کے آزاد ہونے کا یہی منشا تو نہیں ہو سکتا ہے جہاں پہلے آدھے ہندوستانی انڈین سول سروس میں ہوتے تھے اب سارے پاکستانی ہوں۔ یادداشتیں آسانی سے نوٹ نہیں کیا جاہارت آدھے ہندوستانی آرمیوں کے ہاتھ میں آ جاتے۔ یہ سب کچھ ٹھیک ہے مگر اس کی حیثیت ایسی ہے جیسے آپ کے کمانے میں ٹرانزیکشن۔ اصل چیز تو آپ کا ضمیر

بہ چاہا کریں۔ مثلاً صرف انگریزی پر ہی زور نہ دیں کہ آنے والی نسل اپنی ثقافت سے بے بہرہ ہو جائے اور صرف اردو پر بھی زور نہ دیں کیونکہ یہ انگریزی کی وراثت جو آپ کو ملی ہے بہت قیمتی ہے اور باہری دنیا کے ساتھ رہا رکھنے کے لیے یہ ایک ذریعہ ہے۔

ذہیری صاحب جہاں جاتے ہیں وہیں کی کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کر اس کو فروغ دیتے ہیں۔ پشاور میں انہوں نے اہلسن آرٹ سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ اہلسن ہاں کا ایک دریا ہے پشتو میں اس کا مطلب ہے دریاں کا باپ۔ لوگ اس نام ہی سے اتنے خوش ہوئے کہ باقی الفاظ جو آرٹ سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے ہموال گئے۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ اہلسن سوسائٹی کو جا کر کہوں۔ آخری مرتبہ پشاور گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی چھت گر گئی ہے۔ آپ دعا کریں کہ اردو اکادمی کی چھت تو نہ گرے یا کم از کم اس وقت تک نہ گرے جب تک میں غلط قسم نہ کروں یا جب تک ذہیری صاحب یہاں رہیں بلکہ بہتر تو یہ ہوگا کہ باغلی ہی نہ گرے اور جب ساری دنیا کو گرتا ہو تو بھی گر جائے کیونکہ ”مرگ انہو مٹنے وارہ“ اسی لیے جب دریا میں گرے تو سارے دریا خوش تھے کہ یہ دریا روز کا جھڑا ختم ہو بلکہ ایک نئے تو اس وقت کے پرینڈنٹ کو مبارک باد کا ٹیلیگرام بھی کیا یہ اور بات ہے کہ پرینڈنٹ نے ٹیلیگرام نہیں اٹھایا۔ میں نے مضمون یہاں تک لکھا تھا کہ اس ادارہ کے نیکرٹری سید شیر بخاری تحریف لائے تاکہ اکادمی کے مقاصد سے مجھے آگاہ کریں۔ اکادمی کا تحائف ذہیری صاحب نے بھی آپ کے سامنے پیش کیا ہے اور ضمناً میرا بھی۔ شیر بخاری صاحب نے جو باتیں مجھے بتائی ہیں وہ اس قدر باطل ہیں کہ اپنے حائف پر اعتبار نہ کرے ہوئے مجھے کاغذ کے پرے سے پرکھنی پڑیں اور وہ باتیں اس امر کے متعلق تھیں کہ بہاولپور کو اردو کے سب سے کیا امتیاز حاصل ہے پینڈا ایتھنز ہے کہ جیسا دفتری زبان 1849ء سے اردو ہے اور اس کا نتیجہ ہے کہ نہ صرف مسل خواں بلکہ محضر پند اور شیخ اچھی اور دلگھکتے ہیں چنانچہ مسل خواں لکھنؤ حکم حکم کے حاکم سے دخلتہ لے لیتا ہے اور حاکم کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ اس نے کیا حکم دیا۔ دوسرے یہ کہ سید صفی الدین غزنوی اور پھر جلال الدین حیدر اور پھر قاضی مہتاب الدین سراج اہی بھاولپور میں آ کر اترے تھے۔ اور مہتاب الدین سراج نے نہ صرف طبقات کا صریح لکھی بلکہ دوسرے فیروز پٹی کے ہندو بھی سنے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب آتش پلٹوکیا نہ تھا۔ جلال الدین حیدر پہلے پہل اوق شریف میں تحریف لائے تھے ورنہ اوقی ہی رہتا اور کبھی شریف نہ بننا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ رائی اچاں سے نسبت رکھتا ہے۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ کون سی نسبت بہتر ہے۔ اچھا یہ تو ہوئے صفحہ من متاخرین میں سے ارشد گورگانی کا ذکر کیا اور پھر سرمدہ اقتدار اور پھر حفیظ جالندھری کا اور یہ جانتا ہوں کہ اندر نسل کی خاطر میں شیر بخاری اور مسرت حسین ذہیری اور عظیم کپانی کی بھی ذکر کروں کیونکہ ان تینوں کی مشعر کہ ساسی سے آج اردو اکادمی کا افتتاح ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں ذہیری صاحب کا اصرار میرے بہانے اور

اردو اکادمی ادبی گھوڑے پر سوار

اردو اکادمی بہاولپور

آپ اور میں اردو اکادمی کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔ ممکن ہے آپ میں سے کچھ لوگ دیکھنا بھی چاہتے ہوں کہ یہ ہے کیا چیز؟ کیونکہ اکادمی کا لفظ فرانسیسی نثر ادب کے سبب مادام سے کچھ مناسبت یا کم از کم صوتی مشابہت رکھتا ہے اور کچھ نہیں تو موٹ کے سینے میں تو ضرور ہے۔ لہذا آپ میں سے کئی بے قرار ہوں گے کہ اسے دیکھیں یا کم سے کم اس کے بارے میں کچھ سیں۔ حوران باجی کے بارے میں بھی تو ہم سننے ہی چلے آئے ہیں اور صرف ان کے ذکر سے اس درجا عشاق پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کی خاطر میں روزے رکھتے ہیں اور سارا سال نماز پڑھتے ہیں۔ نیت نہ نماز کی ٹھیک ہوتی ہے نہ روزے کے کی ٹھیک ہے چاری عورتوں کو نیت کا کیا پتہ۔ خیر خدا اپنی نیت کسی کے سامنے نہ لائے۔ کم از کم میری نیت کیونکہ آج میری نیت بھی کچھ ایسی ہی ہے یعنی میرا کوئی ارادہ نہیں کہ میڈم اکیلی کے متعلق ایسی کوئی بات کہوں جس سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہو بات دراصل یہ ہے کہ مجھے خود پتہ نہیں کہ یہ کیا چیز ہے۔ میں نے ذہیری صاحب سے ”جو آج نکل آپ کے کتھر پوچھا۔ انہوں نے ہنس کر نال دیا۔ میرے خیال میں (اگر وہ سن نہیں رہے تو آج کچھ باتوں کا) ان کو خود بھی پتہ نہیں۔ ان باتوں میں بھی جانتا ہوں کہ ذہیری صاحب جہاں جائیں ایک نئی دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں تاکہ اگر اپنے ثقافتی تقاضوں کا (یہ لفظ مجھ کے لفظ سے بھی زیادہ قبیل سے امید ہے کہ آپ برداشت کریں گے اور نہیں کر سکتے تو میرے پاس اور کوئی لفظ نہیں ہے) ہاں میں کہہ رہا تھا کہ ذہیری صاحب جہاں جائیں ایک نئی دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں تاکہ لوگ اپنے ثقافتی میاںوں کا سدھار اور سرکار کا پرچار کرتے رہیں اور بیکار سیاسی الجھنوں میں نہ پڑیں۔ اس حد تک تو میں بھی مشتق ہوں کہ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اپنے ٹکوں کا مکانہ کر کے یہ اطمینان کر لینا چاہیے کہ جس در سے میں سفر کرتا ہے اور جس منزل تک جاتا ہے اس کے لیے ٹکٹ ٹھیک ہے کہ نہیں۔ سچ پوچھتے تو میں یہ دعا تم نہ کرتا مگر ہر بات میں دعا قائم کرنی چاہیے تاکہ ایسا نہ ہو کہ لوگ ثقافت کی رو میں بہہ جائیں۔ جیسے ہمارے بیٹے صاحبان اور وہ صاحبان قانون میں بہہ جاتے ہیں اور اصل مقصد قانون کا نہیں دیکھتے کہ عدل اور توازن ہے۔ اللہ آپ زندگی کے عام مضمون میں بھی عدل اور توازن کو پیدا کریں اور ایک طرف نہ

شاعری الفاظ میں نہیں تھی خیال میں تھی۔ گھوڑا کو تھوڑا بڑے تھانیں عربی کبیر شاعر نے افریقہ و عرب کا نظریہ دیا تھا۔ اس کے بعد میرے دو چچا زاد بھائی تھے جن میں ایک نے دبا گھس کیا اور دوسرے نے مرگ۔ ان کا مشہور مصرعہ ہے "اے مرگ دبا سے بھڑا کب تک"

یہاں گھڑا زوالہا ہو گیا ہے ویسے بھی بھڑا سے لہے ہی ہوتے ہیں۔ بہر حال یہ مصرعہ طرح سے کچھ بہتر ہے جو صرف "مرگ" پر مشتمل تھا۔ ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ میرے کہو میں آپ دوسرا مصرعہ لگا دوں گا۔ دوسرے نے کہا اچھا "مرگ"۔ پہلے نے کہا مرگ جو کہ جاتی ہے کتے ترک۔

دوسرے نے کہا یہ تو غلط ہے۔ یہ مصرعہ تو مصرعہ طرح سے بہت لمبا ہے اور بھر ترک کوئی لفظ نہیں ہے۔ پہلے نے جواب دیا جو مرگ کے تلک جانے کی دو لمبی سی ہوئی اور ضرورت شعری سے تلک کو ترک کر دینا جائز ہے۔ شعر اور شاعری کا شوق کچھ اڑتا ہوا تھا کہ ہمارے گاہکوں کے زمینداروں نے بھی شعر شروع کر دیے۔ ایک لڑکا پیاز کے قریب بیٹھا تھا دوڑتا ہوا آیا کہ میں نے شعر کہا ہے۔ "بیٹھا قاسم راہ کہ گھٹتا ز رکھا۔"

یہاں بھی گھٹتا زوالہا ہو گیا ہے مگر گھٹنے ڈرا لے ہی ہوتے ہیں۔ خصوصاً جب کوئی بڑا حاکم تقریر کرتا ہے اور آپ کو مجبوراً سننی پڑتی ہے اور آپ دعا کرتے ہیں۔ کہ اُلّی مجھے نیند نہ آئے۔ میں انکی تقریروں میں اکثر سو جاتا ہوں۔ پھر بتائی جاتے کہ وقت جاگتا ہوں بلکہ بتائی سی سے جاگتا ہوں۔ اور پھر بتائی جاتی ہے لگتا ہوں۔ یہ عادت یعنی سو جانے کی عادت بتائی جاتے کی نہیں میں کاٹنے کے زمانے سے اپنے ساتھ لا یا ہوں۔ اس طرح کاٹنے میں بھی وقت اچھا کرتا تھا۔ اور صحت بھی اچھی رہتی تھی۔ آپ آپ میری طرف دیکھیں تو میں آپ کو کمزور نظر آؤں گا۔ یہ صرف ڈائینک کار کے ہائی کمانے کا نتیجہ نہیں ہے مجھے آپ کے طوں نے آدھا کر دیا ہے۔ آپ بھی کو طاق دیتے ہیں تو اسے حق میرے بھی حرم نام چاہتے ہیں اور کوئی خطا اس کا ہاتھ کاٹ لکھا ہو انہیں کر دیتے ہیں جس کی رو سے وہ اپنے حق میرے دستبردار ہو جاتی ہے اور جو آپ نے کسی نا جائز اثر کے تحت اس سے حاصل کیا تھا۔ مگر آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر وہ اپنے حق میرے کو چھوڑنے پر راضی ہوئی تھی تو اس شخص پر کہ وہ تمام حیات آپ کی بیوی رہے گی۔

مضمون کا باب سے لکھا جا رہا ہے اس میں غم و فتنے کی گئی پیدا ہو رہی ہے میں کہہ رہا تھا کہ اس سلا کے نے یہ مصرعہ کہا "بیٹھا قاسم راہ کہ گھٹتا ز رکھا"

میں نے اس کو داد دی مگر ایک اور سلا کے نے یہ اعتراض کیا کہ گھٹنے کا کز رتا نظر نہیں آتا لہذا اس مصرعہ کو بدل کر دیں کہ دبا جاتا ہے

بہانوں کا کارگر نہ ہونا یہ ایک لمبی داستان ہے۔

جب میں بچکس اکٹوبر گزار رہا تھا کادی کے افتتاح کے لیے مقرر ہوا تھا تھی بہاولپور پہنچا تو دیکھا کہ زبیری صاحب پر فیس نہیں اسٹیشن پر موجود تھے وہاں انہوں نے یہ خوشخبری سنائی کہ افتتاح 29 اکتوبر کو ہوا اور وہ بھی میرے ہاتھوں سے۔ اسٹیشن پر زبیری صاحب اپنے ساتھ ساری دنیا کو لے آئے تھے۔ کسی صرف یہ تھی کہ جینز ساتھ نہیں تھا۔ جینز سے طبیعت میں جوش پیدا ہوتا ہے اگلے وقتوں میں اس سے لڑائی کا جوش پیدا کیا کرتے تھے اب شادی کا جوش پیدا کیا جاتا ہے۔ ان ساری باتوں کو کہہ کر مجھے کھٹا یاد آ گیا۔ صاحبان! لفظ پاکستان ناموس کے اور اراق میں ایک قطعی ہے جو دو افحات زمانہ پر مقررہ مزاج کے لچھے میں پر مذاق رائے دیا کرتا ہے۔ ایک مرتبہ مجھے لے لکھا کہ لاٹ تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک بڑا لاٹ یعنی پرینڈنٹ دوسرا بھٹ لاٹ یعنی گورنر جنیرا چھوٹا لاٹ یعنی مشور۔ مگر زبیری صاحب کے قتل کو کہہ کر میں چارہوں کے نسخے کی رائے بدل دوں۔ میں بھی بدلے کے طور پر مجھے کچھ تحریف کرنی چاہیے۔ کچھ روز زبان کی کچھ زبیری صاحب کی کچھ کادی کی اور ضنا ایک آدھ لفظ اگر اپنی تحریف میں من سے نکل جائے تو آخریں بھی انسان ہوں۔ زمانے کا کاروبار بھی اس طرح چلتا رہتا ہے اور اردو ادب کی خدمت بھی ساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہے۔ اس سے زیادہ کیا خدمت ہو سکتی ہے کہ پھانستان کا ایک باشندہ دریاؤں اور صحرائوں کو تیر کا می سے عبور کر کے ڈائنگنگ کار کے ہائی کمانے کی پردہاندہ کر کے چڑھان کے قریب اردو کادی کا افتتاح کرے۔ میرے خوشی سے آسودہ لگتے گئے کہ میں اپنی خدمت باکم از کم اتنی اہم قربانی کے قابل ہوں۔ اس کادی کی قسم مجھے باہر یاد آئے گئے ہے جب وہ رانا ساکے سے لڑا تھا۔ مجھے وہ واقعہ یاد رہا ہے جب باہر نے شراب کے پیالے توڑ ڈالے تھے میں بھی ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے میں نے ساری پشتو حادی ہو پھانستان توڑ دیا ہو خوشحال خاں شکک کو چھوڑ دیا ہوتا کہ اردو کو فروغ ہو۔ میں نے پھانستان کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ کسی دن آپ کو اردو کادی کی ایک شاخ کا بل میں کھولنے کا شوق ہو بلکہ اس لیے کہ ہماری سرزمین کے حقیقی مشہور ہے کہ وہاں کے لوگوں کو اردو سے ذرا دور کا تعلق ہے۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بعض دفعہ وزیر تعلیم ایسے لوگ بنائے جاتے ہیں جن کی علمی استعداد ذرا کم ہوتا کہ وہ اپنی لیاقت کو مد نظر رکھتے ہوئے دوسروں کی لیاقت بڑھانے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اردو کادی کی صدارت کے لیے آپ نے مجھے کیوں منتخب کیا۔ مگر اب جو آپ نے مجھے چاہا ہے تو آگ لگے پھانستان کو۔

ویسے ہمارے گاہکوں میں بھی اردو شاعری کا چرچا رہا ہے (گو آپ تک نہیں پہنچا) سب سے پہلا شاعر میرا ایک بھائی تھا جس نے ایک انگریز خاتون کو گھوڑے پر سوار کیج کر بے ساختہ کہا تھا "میں صاحب عربی گھوڑے پر سوار"

”بیٹا قہار کو کہو کہ گزریا“

یہ ان دنوں کی بات ہے جب انتحاریات نہیں ہوا کرتے تھے۔ دیہات میں بھی اور پہاڑوں پر بھی لوگ شہر کا کرتے تھے۔ پھر انتحاریات آئے تو لوگ سیاست میں مبتلا ہوئے۔ شاعری ختم ہوئی۔ اب میں بھرا میرہ کرنے لگا ہوں کہ کچھ ہوگا۔ اور کچھ نہیں تو اردو اکادمی بھادپور کے حالات پڑھتے رہیں گے۔

میں نے یہاں آتے ہی ہی چھا کہ یہ اکادمی کیا بنا ہے۔ نیکراری صاحب کو بھی احساس تھا کہ یہ لفظ میری بساط سے باہر ہے۔ انہوں نے میرا لفظ فرما کر توضیح کی اور کہا کہ یہ انگریزی لفظ آئیڈی کی تعریف ہے۔ اب اگر تعریف کا لفظ اکادمی کے معنی میں ہو تو آپ مجھے جو چاہیں سزا دیں۔ تعریف سے مطلب عربی کا رنگ دینا ہے۔ عمل تعریف کی وضاحت کرتے ہوئے نیکراری صاحب نے کہا پوٹاٹو (POTATO) کا لفظ مصر میں بتایا نہیں گیا۔ میں نے پوچھا کہ آلو کیوں نہیں بنا۔ جواب دیا کہ مصر میں آلو کی بیڑا سے آتے ہیں اس لیے انگریزی نام کی تعریف ہوئی۔ گو یہاں بھی ہم بچھے ہی رہے۔ اگر آلو نہ بھیج سکتے تو کم از کم آلو کا نام ہی بھیج دیا ہوتا۔

مگر میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ یہ تعریف ہے یا تخریس۔ میں یہ پوچھ رہا تھا کہ اکادمی ہے کیا چیز؟ اس پر نیکراری صاحب نے دستور العمل کی ایک نقل دی جس کی دفعہ ایک میں لکھا ہے کہ اردو زبان کے تحفظ و ترقی و اشاعت کا نام ہے اردو اکادمی۔ یہ دستور العمل پڑھ کر وہ شخص میرے پاس تک مصعب ہو گیا۔ جسم سے عربی نکلتی گئی۔ قرآن شریف بھی بھول گیا۔ قرآن کے آسان جملے تھے مثلاً ”کان من الکافرن“ یعنی سارے کافروں سے ہیں۔ یا پھر ”غروی صاغت“ یعنی موی کا گھاگر پڑا اور کسی نے کہا یہ کسابت کی لفظی ہے کیونکہ ہم تو غریبی کا نام سنتے آئے ہیں۔ غروی بھی نہیں سنا۔ میرے وہ بھائی جنہوں نے ہم صاحب کو عربی سکھوڑے پر سوار کیا تھا اگر یہ دستور العمل پڑھتے تو یہ ساعدہ کہنے کا اردو اکادمی عربی گھوڑے پر سوار ہے۔ اب ذرا سچے دفعہ-3

”اردو کے معیاری کتب کے تراجم کا دوسری زبان میں بندوبست کر کے تاکہ بین الاقوامی افکار و معارف سے اردو زبان و ادب متعارف ہو سکے۔“ اور سنے اردو علی نیرنی کے قیام کے تخیل کو بند رہنا چاہو۔ پتا نہ کی کوشش کرے گی۔“ یہ جامعہ عمل اچھا رہا۔ گو جامعہ عمل اترا دکر عمل کا جامہ اس کو پہنا دینا گے کوئی بڑا سا اور کوٹ ہوگا۔ کیوں نہ ہو افواج جو جامعہ ماسے میں ہو رہا ہے۔ مگر ان جملوں میں سے آپ حروف جاہلہ ”کرے گی“ کے الفاظ نکال دیں تو باقی جو کچھ رہ جائے گا۔ وہ اردو اکادمی ہوگی

دستور العمل دیکھ کر غالب کے مفرس کا کام کھٹن میں بہت مدد ملی ہے۔ بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ انہوں نے اپنے اس مشہور شعر میں اردو اکادمی کے قیام کی چارچنگ لکھی تھی۔

نار لہو مرغوب بت مشکل پند آیا
نشاے بہ یک کف ہر دن صول پند آیا

غالب خوش قسمت تھے کہ انیس ہندو شاہین مل گئے۔ ایک پٹان مدرس نے بھی اس قسم کے کچھ مصعب اور مفرس شعر پشتو میں کہے تھے۔ جب اس نے ایک پٹان دیہاتی کو سنا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے پوچھا ”یہ کس کے شعر ہیں۔“ جواب دیا۔ ”حقیر کے“ اس نے کہا ”خدا تجھے اور حقیر کرے“ یہ پشتو ہے یا قرآن شریف۔“ البتہ جو قواعد و ضوابط صاحب صدر کی طرف سے زیر دفعہ 8 دئے گئے ہیں۔ وہ کچھ مجھے ہیں مثلاً

”دفعہ ایک (الف) ان قواعد کا نام اردو اکادمی رولز 1959ء ہوگا۔“

(ب) ”یہ قواعد فوراً نافذ العمل ہوں گے جب اس کے مضمون یا اسباق کے اعتبار سے کوئی امر اس کے مفاد ہو۔“

میں ہوتا تو یوں لکھتا ”نیز آ نکہ بہ اعتبار مضمون یا اسباق مفاد میں ہو۔“

مجھے میں جیسا تھا ہوں تاکہ نیکراری صاحب زیادہ ناراض نہ ہوں۔ مگر آپ کو یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ میں اردو کی خدمت کر رہا ہوں۔ ورنہ نہ جانے آپ اس کو کتنی غیر زبانوں کے سینگ لگائیں گے۔ یہ تو پہلی بار دیکھا ہے۔ مگر قسم کرنے سے وحشر ایک غلط فہمی دور کر دینا چاہتا ہوں۔

یہ پہلا موقع نہیں کہ میں سن رہا ہوں کہ جمن نے مجھے وارفت مضمی میں کچھ دیا ہے۔ اردو نظم اور قاری کے ترستے اور علم و ادب سب وہ ساتھ لے گئے ہیں اور آج میں اعلان کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے پاس سوائے ایک چاندی کے گرنے کے اور کچھ نہیں چھوڑا اور وہ گرنے تو وہ اٹھا سکتے تھے اور نہ میں اٹھا سکتا ہوں البتہ ایک مرثیہ انہوں نے چھوڑا ہے اور وہ بھی میرے مرنے پر لکھا تھا۔ یہ 1926ء کی بات ہے جب ہم ولایت میں تھے۔ میں بتا رہا ہوں تاکہ اس لیے وہ کسی اور چیز کا غرض نہ کر لیں۔

سوچتا تھا کدھر گیا رہم
آئی آواز مر گیا رہم
اک کہانی جہاں میں تھا موجود

زبان یا رمن ترکی و من ترکی نمی دانم

ملتان اکادمی

حضرات! دو ڈیڑھ سال ہوئے مجھے میرے شفیق دوست مسرت حسین زبیری نے جو اس وقت بہاولپور میں کسٹرو تھے بہاولپور اکیڈمی کے افتتاح کے موقع پر بلا یا تھا اور اس وقت مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اب چونکہ ہم آزاد قوم ہیں اس لیے اکیڈمی کو اکادمی اور ہندوستان کو بھارت کہنے لگے ہیں۔ اس وقت میں نے کہا تھا کہ غالباً ”اکادمی“ کا میڈم سے کوئی رشتہ ہے جو فرق میں عام پڑھا جاتا ہے اور عام میں اپنی طرف کھینچا ہے یا شاید (جج اردو میں) کھینچتی ہے۔ نہ معلوم یہ ذکر موٹ کے سینے کب میری کھج میں آئیں گے۔ ویسے دیکھ کر تو میں ذکر اور موٹ کی تمیز کر لیتا ہوں چنانچہ دو ٹوک کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہاں میرے سامنے اس وقت حضرات ہی حضرات ہیں۔ محاضرات کوئی نہیں۔ یہاں پھر ایک مشکل پیدا ہو گئی ہے۔ میں تو محاضرات کو مستورات کے وزن پر استعمال کر رہا تھا مگر غیر ذرا اوقات سے جو ذکر و موٹ کے محفلوں میں میرے لیے رہنما ہے ”معلوم ہوا کہ محاضرات اس طے کو کہتے ہیں جس میں جن باتوں میں جمع کیے جائیں۔ خدا نہ کرے کہ آپ جن بھوت ہوں مگر خدا ایسا تو کرتا ہے کہ ہم آپ جیسے لوگوں میں سے جن بھوت پیدا کر دیتا ہے دنیا میں جو سرگئی کرے اس کو جن کہتے ہیں۔ جو کسی سرگئی کے سر پر سوار ہو جائے اس کو بھوت کہتے ہیں اور جو بھوتوں کے بھی سر پر سوار ہو جائے تو اسے بھوت نا بھوت کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے اگر آپ حضرات ہی رہیں تو بھوت ہے۔ زیادہ سے زیادہ غلطی یہی ہو سکتی ہے کہ حضرات کو حسرات پڑھا جائے یعنی حسرتوں کی جمع اور حسرتیں بھی میری جو جگہ تک بھری ہوئی ہیں۔ کہیں ان فہلوں پر جو جن کھلے مرہما جاتے ہیں۔ مرہما سے کیا ہیں جنہیں کھلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ کہیں کسی ایسی اکیڈمی میں جو بہاولپور ڈپٹی کراڈی بن جاتی ہے اور ملتان میں اکادمی۔ نہ برابر زبرد کے فرق سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس اکادمی کا چلانا والے ایک آدمی ہوگا۔ حقیقت سے یہ معلوم ہوا کہ دو آدمی ہیں آغا شیر شاہ المعروف بہ قوش جو بعض مقام پر اپنا نام راقم المعروف بھی لکھتے ہیں اور آکٹوشی سے اکادمی کی روکھ دو لکھتے ہوئے اردو زبان کا مرثیہ بھی لکھ دیتے ہیں۔ بہاولپور میں تو اس وقت کے سرکاری شیر بخاری نے صاف گوئی سے کہا تھا کہ یہ اردو اکادمی ہے مگر یہاں ملتان میں اردو کا لفظ کسی مصلحت سے استعمال نہیں کیا گیا۔ ایک تو آغا شیر شاہ

ہائے	اب	وہ	بھی	ہو گیا	معلوم
علم	و	آداب	میں	چاند	تھا
اس	کا	ہر	قول	تازیانہ	تھا
اس	چ	طرہ	کہ	فیلسوف	بھی
مگرچہ	تھوڑا	سا	بے	طرف	بھی
میں	کی	مع	کا	تھا	وہ
مطلق	تھا	اس	کا	آرت	آپ کی
ناک	بھی	اس	کی	جی	اچھا
گ	گما	ہا	مر	تو	ہے
اللہ	نہیں	اسے	جیب	تھا	وہ
رہتا	گھر سے	میرے	قرب	تھا	وہ
جب	کبھی	پار	اس	کی	آئے
اس	کی	شوق	مجھے	ستائے	کی

♦ ♦ ♦

خال قاری سے زیادہ چل کر رکھتے ہیں۔ دوسرے اردو کے لفظ کے نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر وہ اکادمی کی کاروائی قاری میں بھی لکھ دیں تو کوئی محضر نہیں ہو سکتا۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ "اکادمی کے گزشتہ سال کی روئیدہ اکادمی کی اپنی زبان میں ہوتی تو اکادمی کو ایک گونہ سرت حاصل ہوتی۔" میں سوچتا رہا کہ اکادمی کی اپنی زبان کون سی ہے۔ مثلاً تو نہیں؟ اگر ہے تو میں مثلاً زبان بھی جانتا ہوں اور اس کا فقرہ جو تیس سال ہونے کا ہے ایک محفل میں سنا تھا اب تک یاد ہے۔ سائیں پھر نڈل سو؟ جس کا مطلب میں یہ سمجھا تھا کہ کیا آئندہ پھر کبھی ہم نہیں ملیں گے؟ ہم نے جواب دیا "کیوں نہ ملو" اور حاضرین اور خصوصاً معاضرات نے ہاری مثلاً کو پسند کیا تھا۔ بہر حال ہم نے "کیوں نہ ملو" کا وعدہ آج تیس سال بعد پر کیا ہے لیکن افسوس صرف اتنا ہے کہ یہ وعدہ گانے کی محفل میں پورا نہیں ہوا۔ معلوم نہیں مکتان اکادمی گانے کو کتنا جھنجھتی ہے یا نہیں۔ پاکستان آرٹ کونسل میں تو ہم گانا بھی گانا کرتے ہیں اور بھانا بھی۔ بلکہ تیری چڑی یعنی ناچ کو بھی جوان دونوں سے بہتر ہے۔ بہت سی چیز وہاں آپ مکان و زمانہ کے اعتبار سے ناچنا کرنا دیتے ہیں۔ مثلاً اگر گانے اور ناچنے کو کھلے قفس و سر دکھا جائے اور اس کا افتتاح کسی مستحق آدمی سے کر لیا جائے اور وہ بازار کے پلاخانے کی بجائے کسی فنکے میں ہو تو اسے آرٹ کہتے ہیں اور اس کا اثر فون لطیفہ میں کیا جاتا ہے۔ ایک وعدہ ایک سرکاری ملازم کے خلاف یہ جرم قائم ہوا کہ اس نے ایک گانے والی عورت کو کچھ زمین دوائی تھی۔ اس نے اپنی صفائی میں یہ کہا کہ وہ تو آرٹ ہے۔ جس زمین کی خرید و فروخت پر یہ تنازع پیدا ہوا تھا اسے بھلا کر بحث اس بات پر شروع ہو گئے کہ خریدنے والی آرٹ ہے یا محفل گانے والی۔ چونکہ سرکار کا پلہ ہماری قہودہ آرٹ گانے والی ہی رہی۔ مگر کیا کوئی گانے والی قیمت دے کر بھی زمین نہیں خرید سکتی؟ یہ عجیب بات ہے کہ وہ بے چاری آسمان سے بھی غم رہا ہے اور زمین سے بھی۔

بات یہ ہو رہی تھی کہ اکادمی کی اپنی زبان کون سی ہے اور غرض صاحب کیوں اس کا مرتبہ پڑھ رہے ہیں۔ اسنے میں میری فکر سے ان کی دور پورٹ گزری زبانہوں سے لیبران اکادمی کو 1955ء میں پیش کی تھی۔ ایک نگراں لفظ ہو "علم ادب اور فن کے لیے صحیح ذوق اور فکر کی ترویج اور تربیت اردو زبان کے عملی اور ادبی ذخائر میں عصر حاضر کے صحت مند تقاضوں کے مطابق مفید افکار کا اضافہ اور شعروادب کے لیے پاکیزہ ذوق کی اشاعت اور علم ادب اور فن کے ذریعے مملکت اور معاشرہ کے لیے ذوق خدمت کی پرورش یہ تھے وہ عزائم جو مکتان اکادمی نے اپنے لیے قبول کیے۔"

آپ نے بھی سنا ہے "قرعہ نام نام دیا اندزدند۔"

حضرات! یہ پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ مکتان اکادمی کا حاضر بہت اچھا ہے اگر یہ قاری کے الفاظ جو حضرت "راقم الحروف" نے

1955ء میں استعمال کیے تھے آپ نے سات سال میں ختم کر لیے ہوتے تو اب تک آپ کا بل بقی گئے ہوتے۔ بہر حال میں خدا کا اور اپنے سکول کے مولوی صاحب کا شکر بھلا یا کہ انہوں نے اردو گرامر کے پڑھنے کی توفیق دی اور حروف چار پر خاص زور دیا۔ اگر آپ کے مولوی صاحب نے بھی آپ کو ایسی کسی مفید بات سے آگاہ کیا تو بہ حقیقت آپ کو معلوم ہوگا کہ کسا کے کی حروف چار ہیں اور غرض صاحب کے اس مختصر کام میں جو میں نے ابھی پڑھا ہے گیارہ مقام پر استعمال ہوئے ہیں۔ خوشا حروف چار اگر یہ مکتان میں نہ ہوتے تو ہم کبھی پتہ لگا سکتے کہ غرض صاحب اردو بل رہے ہیں یا قاری۔

بہر حال چونکہ مکتان اکادمی کو نیکو نوری صاحب کے الفاظ میں علم و ادب اور فن کے لیے صحیح ذوق اور فکر کی ترویج اور تربیت کرنی ہے۔ اس لیے وہ آموں اور سمجھوروں کا ذکر تو نہیں کر سکتے تھے۔ اگرچہ آموں اور سمجھوروں کے کھانے کے لیے صحیح ذوق پیدا کرنا بھی (میں پھر ان ہی کے الفاظ استعمال کرتا ہوں) مملکت اور معاشرہ کے لیے ذوق خدمت کی پرورش کے برابر ہے کیونکہ آموں اور سمجھوروں کی تعلیمیں بھی ہوتی ہیں اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کو کہاں پھینکا جائے۔ پچھلے ایام پاکستان کے موقعہ پر گورنمنٹ ہاؤس کی مصرانہ پارٹی میں یہ مشکل پیش آئی۔ وہاں انگترے نے لائے عجیب اور شاید کیلے بھی تھے۔ حضور! میں نے چائے کے ساتھ اگر کسی کے اصرار پر ایک آدھ کپڑا اس نظر سے سے کھایا ہو کہ پیٹ کے لیے اچھا ہے تو کھایا ہوگا مگر انگترے نے لائے اور سیب کو چائے کے موقعہ پر کھانا چائے کی بھی ہے عزتی کرتا ہے اور پھل کی بھی۔ لیکن اگر گورنمنٹ ہاؤس میں کمانے کی بجائے اپنی بیویوں میں گھر لے جائیں۔ بلکہ اس سطح میں ایک آرڈیننس جاری کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ کیونکہ آرڈیننس کے بغیر ہم خود کو کاروبار نہیں کرتے۔ اب ایام پاکستان کا سننے۔ اس دن صبح کو میں نے قائد اعظم سوسائٹی کے ایک جلسے میں پڑھا تھا کہ شام کو جب آپ گھر واپس جائیں اور بیوی پوچھے کہ آپ نے پاکستان کے لیے آج کیا کیا ہے تو آپ کیا جواب دیں گے؟ میری تقریر کا بھی اکتا گھرا اور فوری اثر نہیں ہوا چنانچہ اس دن ہوا کیونکہ ابھی شام نہیں ہوئی تھی کہ گورنمنٹ ہاؤس کے تئیس ہزار آدمی پر پہلے چھکوں کے ڈھیر کے ڈھیر پڑے تھے۔ انگترے اور مالوں کے کشوں کے پٹنے لگ گئے تھے۔ ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹی پلیٹ میں جو ایک ہی پھل کی حامل ہو سکتی تھی ایک عدد انگترہ ایک مالٹا اور ایک عدد سیب لے کر نکلا۔ انہوں سے کل کر جب اس نے مجھے کھانا پکایا تو صحت کہا "یہ آپ کے لیے آج ہوا۔" پھر اسے خیال آیا کہ کہیں میں تینوں نمونے نہ اٹھا لوں۔ تھریس کہا "جواب آپ کو پسند ہو لے لیں" مزید تشریح کے طور پر کہا "مجھے آپ کی تقریر بہت پسند آئی۔" میں اپنی لفظی کو سمجھ کر وہ شام کو کجا کر بیوی سے کہے گا کہ پاکستان کے لیے میں نے سرکاری خرچ پر سب مالے اور انگترے کھائے ہیں۔ اس کے علاوہ سرکاری خرچ پر سٹاف کاروں میں پھرا

ہوں۔ ٹیلیفون بھی کئے ہیں اور فکارت بھی کیا ہے۔ اگر بی بی پتھکے فکارت کے دن کیا چھٹی تھی تو کہے کہ قہور! سا کام بھی رکھا تھا مگر چونکہ کاغذات نہیں چھپتے تھے اس لیے اگلے مہینے پھر جانا پڑا۔ جب تک مہمانیاں بھی وسط ایشیا کی طرف سے آجنگا ہوں گی۔ خبر یہ کہ ٹیلیفون اور سٹاف کا راز فکارت تو پہلے بھی تھے مگر آج کی خبر کا گھبراہٹا اثر ہوا کہ میں نے سوچا اپنے مردہ جسم کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ سرکاری پھل بھی کھاؤں تاکہ پاکستان کی خدمت زیادہ مستعدی سے کر سکوں۔ لان کے وسط میں مجھے مظفر احمد نے جو میری طرح تھا کسی غم میں جتا آخر آتے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے چٹکوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اگلے سال سے یہ بند ہونا چاہیے۔ مگر میں نے یہ سن کر میں نے غیر ضروری طور پر خوش صاحب کے الفاظ میں کچھ اس طرح کی بات کہی ہو۔ ”یہ لوگ حکمت اور معاشرہ کے لیے ذوق خدمت کی پرورش کر رہے ہیں اور علم خورون و دلچسپین یعنی کمانے اور بچنے کے علم کو ترجیح دینے کے لیے بھیجی ذوق اور فکری تربیت میں مصروف ہیں۔“ اور اس کے علاوہ خوش صاحب کے بھیجی ذوق کو چھوڑ کر یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ جہاں کل ہیں وہاں خانگاری ہیں اور جہاں مانتا ہے وہاں چھٹا بھی ہے۔ مظفر احمد نے کہا ”یہ صرف عکس ہے اور مالے کی ہی بد قسمتی نہیں۔ یہ لوگ ہر چیز کی طرف توجہ دیکھتے ہیں۔ پچھلے دنوں سزیکینیٹی جی شاید رامیں..... فقرہ مکمل رہ گیا کیونکہ اسے میں گورنر صاحب تحریف لانے اور سب ادھر لپکے۔ البتہ کوئی مچھلا غالب کا ایک مصرعہ ذرا ہی تحریف کے ساتھ پڑھتا ہوا میرے پاس سے گزرا۔“ دامن کو آج اس کے حیرانہ کچھنے

اب اگر گورنر صاحب سوکر کے قافلے پر بھی ہوں تو یہ لوگ سیدھے ان کی طرف لپکتے ہیں اور اس صراطِ مستقیم میں اگر کوئی چیز از قسم انسان مائل ہو تو اسے درخشاں نہیں سمجھتے اور اگر وہ چیز خود راستے سے نہ ہوتے تو اسے پال کر دیتے ہیں۔ اگر تو وہ چیز خود بھی اس طرف لپکتی ہے اس لیے پال ہونے کا خطرہ کم رہ جاتا ہے۔ میں پامالی کے خوف سے ادھر ادھر بچنے کی ہاتھ پائی کر رہا تھا کہ خود گورنر صاحب کی مجھ پر نظر پڑی اور نظر بھی اس لیے پڑی کہ ان کا قد اونچا ہے۔ اونچے قد اور اونچے مقام کا یہ بڑا فائدہ ہے کہ زندگی کی پتلیاں نظر آتے لگتی ہیں۔ اس لحاظ سے میرا قد بھی مفید رہا کیونکہ جہاں ہر طرف بلندی ہوتی ہو وہاں ایک چھوٹی سے بستی زیادہ جاذب توجہ ہو جاتی ہے۔ خبر جب گورنر صاحب کی نظر مجھ پر پڑی تو انہوں نے مجھے اپنی کشادہ بھل میں بنا دی۔ لوگ بھڑکے اور ایک نئی سونگ کے تجویز سے مجھے ان سے ملیدہ کر دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مجھے ڈھونڈ رہے تھے مگر میری لاش کنارے پہنچی جگہ تھی اور میں اسے نظر بچا کر گھر لے گیا۔

اب میرا خیال ہے کہ یہ چٹکوں والا ضمن چھوڑ دینا چاہیے اور بس یہ آخری چھٹکا پیچک کر چھوڑ دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ مہمان

اکاکی کو خیال تھا کہ میں لاہور سے اپنے ساتھ کل اداؤں کا گہرا بکٹ تو میں نے چھپکی دی دیے ہیں۔ مگر میں نے اس کا سبب یہ ہو کہ اہل مہمان کے بارے میں کچھ عجیب قسم کی باتیں مشہور ہو گئی ہیں۔ مثلاً میں نے یہ سنا ہے کہ یہاں اگر کسی مشہور ہانگ کے مالک کے گھر جائیں اور وہ آم کھائے پر راضی بھی ہو جائے تو کھلیاں قہیلے میں بیچ کر تا جاتا ہے تاکہ اور کوئی ان کو کشت کر کے اس قسم کا آم پیدا نہ کرے اور وہ کھیلادریا میں پھینک دیتا ہے جس طرح گنگا میں لاش کے کھول پھینک کر دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خوش صاحب نے ہی زمینداروں کے اس انداز تو شیخ کو اپنا لیا ہے۔ جب اکاکی آپ کی ضیافت طبع کے لیے کوئی جلد کرتی ہے تو اس کی روایتیں اس کی یہ محسوس ہوتا ہے جیسے آم کی کھلیاں قہیلے میں بیچ کر جاری ہوں۔ الفاظ کی کوچ آپ کے کانوں میں رو رہ جاتی ہے۔ مطلب اکاکی کے کارکن سیٹ کے لے جاتے ہیں۔ کچھ نہیں آتا کہ جس شہر میں آم کے متعلق ایسی روایات موجود ہیں وہاں کیوں ابھی تک وہی پرانے چار گھنٹے مشہور ہیں۔ ”گزر گما گدا گورستان“ گردو کرما کہاں نہیں اور گدا آری تو ہماری سرشت میں ہے۔ گدا اگر بھی تیار کما تا گنا ہے اور ہم بھی تیار چر ماگتے ہیں جو صحت کے بغیر حاصل ہو۔ ”اقد غلظا الانسان فی حسن تقویم“ خدا نے انسان کو بہترین فطرت دے کر پیدا کیا یعنی ایک ایسی فطرت دے کر جو سوچنے بچنے پر مائل ہے۔ ”تم روداد و اصل السالین“ پھر اس کو پیٹ دے کر پست کر دیا اور وہ پچک مانتا ہے۔ کبھی اکیسے فقیر کی صورت میں کبھی قومی حیثیت میں دوسرے قوموں سے۔ اقبال نے تو یہی بک کبہ پا کر شرانے مانگتے والے بھی فقیر ہوتے ہیں۔ ”گوئی مانے پانمانے میر و سلاطین سب گدا“

البتہ مہمان کے جو تھے قہنے کے بارے میں یہ بات درست ہے کہ جب ہم لاہور کی طرف سے شہر میں داخل ہوتے تھے تو سب سے پہلے قبرستان نظر آتا تھا مگر پہلے جہاں قبرستان ہوتا تھا وہاں ایک وکیلوں کی کالونی ہے اور جب میں ادھر سے گزرتا ہوں تو یہی خیال دل میں آتا ہے کہ انہوں کو اس کی کیا ضرورت پڑی تھی کہ قبرستان میں ہی افسری کریں۔ کیا ان کی نوکری میں کافی قبریں نہیں کھودی گئیں۔ کیا پانچ سال کے بعد ان کو ایک نئی قبر کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

مطلب یہ کہ میں مہمان سے کافی واقف ہوں اور اگر یہ میرے پاس تعارف مہمان پر شیخ اکرام الحق صاحب کی وہ تقریر جو انہوں نے پروفیسر آغا سے سعید نسکی کے آنے پر پرسوں قادی میں کی تھی چلتی ہے۔ لیکن مجھے آپ آغا نے نسکی کی طرح محض کھانوں پر اور ایسے شہروں پر نہیں تال سکے کہ

چہار چہرہ است قہقہہ مہمان
گردو گردو گردو گردو

رہایات متان جو مرعیام نے لکھی ہیں شاید شیخ اکرام الحق صاحب کی نظر سے نہیں گزریں ورنہ وہ تعارف نامے میں یہ واقعات ضرور بیان کر دیتے۔ اس کے علاوہ اور تمام باتیں درج ہیں مگر چونکہ ان کا مقصود فارسی زبان میں ہے جس کے آپ سب نے نہ پڑھا ہوا ہے اس لیے چند کام کی باتیں بتا رہا ہوں۔ جب محمد بن قاسم کے کافی عرصے کے بعد ان مجبوروں کی گھنٹیوں سے جو ان کی فوج عرب سے زاوراد کے طور پر لائی تھی تھکسا بن گئے تھے تو رضیہ سلطانہ کو ان گھنٹاؤں کو دیکھنے کا شوق ہوا اور اس نے متان آنے کا ایک مقبول سیاسی سبب تلاش کیا۔ چنانچہ بقول صاحب تعارف نامہ اس کی آمد بتریب کا دیوبند نامہ مکتا تھی۔ یعنی متان کے حاکم کو ادب کھانے کی تقریب میں۔ یہ پیش کشا کہ اس زمانے میں متان کا حاکم کشر ہوا کرتا تھا یا اپنی کشر ہونے پر بات قابل غور ہے کہ حاکم کو ادب کھانے کی ضرورت پڑتی رہتی تھی اور اس سلسلے میں تقریبیں منعقد کی جاتی تھیں۔

اس کے بعد امیر خسرو نے اور پانچ سال متان میں رہے اور شاید زیادہ دیر رہے مگر کوکوں نے نگاہ آ کر ان کے سر پر آسمان کی نوکری رکھ دی اور کہا ”جل“ یعنی چلے جو۔ وہ چلا کرے یہ شعر پڑھ کر چلے گئے۔

من کہ بر سر منی نہاد
بار بر سر نہاد

اس کے بعد ہمایوں کا گزربہوا جو اکی تلخاں میں تجزی سے متان کے راتے ایران چلا گیا۔ اس کے بعد متان کا صوبہ شہزادہ اورنگ زیب کے سپرد ہوا جو ایک دیندار حاکم تھا اور چھوٹی سی ڈاڑھی بھی رکھتا تھا اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد لغاری صاحب کشر ہو کر آئے جو اورنگ زیب کے علاوہ محمد پر بھی عقیدہ رکھتے ہیں اور اپنے عقیدوں کی وجہ سے تکلیف میں رہتے ہیں مگر شاید ان سے پہلے آقا شیر احمد خاں شوش وارد ہوئے۔ اور بقول صاحب تعارف نامہ ”تاہیں انجمن ہائے کیر مثل متان اکاوی نہاد۔“ یعنی متان کو چھوڑ کر ہلالہ کے قریب اکاوی کی بنیاد ڈالی۔ ایسی بڑے بنیادیں شیروں سے دور ڈالی جاتی ہیں۔ مثلاً اسلام آباد اور فیروز کالونی۔ اکاوی کی بنیاد پڑنے کے بعد ہماری ہو جاتی ہیں لیکن اگر آپ تعارف نامے کی تحلیل کرنا چاہتے ہیں تو لکھ دیں کہ آغا نے تعلیمی کے ضمیمہ چھ سال بعد ایک شہنشاہ ایرانی المعروف بہ رستم بلقانی بتریب کا دیوبند نامہ اکاوی متان آئے تھے۔ رستم کے نام سے مجھے ایک دفعہ قسے یاد آئے اور شاید آج کی تقریب میں آپ کو بھی یاد آئیں۔ اگر پسند آئے تو کم از کم بعض اصحاب کا تقاضا ہے کہ ہاں جانے کا جو ”اسلوک“ کے وزن پر پڑھتے ہیں کہ میرا اصل نام کیا ہے۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ ایک نویں جماعت کے طالب علم نے مجھے خط لکھا کہ جب بھی آپ کی تقریر اخبار میں آتی ہے تو ہمارے گھر میں اس بات پر بحث ہوتی ہے کہ آپ کا اصل نام کیا ہے۔ یہ

ان کو آپ نے گرمی اور گداگری سے ایذا دیا کہ اب چھ سال ہوئے کسی ایرانی نے یہاں آئے کا نام نہیں لیا۔ مگر آج نیم پلٹے ایرانی کو آپ نے بلا یا ہے وہ آپ کے گرا بھی طرح سے جانتا ہے اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ آسمان کے علاوہ یہاں کا سونہر ملو بھی مشہور ہے جس کے بیشتر حقوق بحق خدمت صاحبان محفوظ کر دیے گئے ہیں۔ کم از کم خدمت تو میرے پاس ہر سال ہزار کا کچھ حصہ بھیجتے ہیں۔ میں ان کا نام نہیں لیتا مہاراجہ زھمیا بندہ کریں۔ البتہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب ان کے مریدوں کے ضعف اعتقاد کے سبب تھروں میں کی ہو جائے تو وہ سونہر ملو ہزار سے خرید کر بیچ دیتے ہیں اور ہزاری بیچ کھانے سے میرا عقیدہ اور گاداؤں خراب ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک چیز دیگر اسات کراں راٹھا جو گندہ جس کا علم مجھے تعارف نامے سے ہوا۔ لیکن ہے کہ متان اکاوی کے احاطے میں (جب وہ بن جائے) مجبور کے درخت بھی ہوں۔

ان چیزوں کا خیال رکھتے ہوئے میں نے متان کا آئینہ دیلا ہے اور اسے متان والوں پر تحقیق جان لو کہ تہاری ان خدمتوں کے سلسلے میں جو تم نے محمد بن قاسم کے وقت میں کی تھیں تم کو جو چار حقے دیے گئے تھے وہ ادب یوں پڑھے جائیگے۔

چار جز است چھ خدمت ملو و خرا
آم و خدمت و ملو و خرا

لیکن آپ اگر حقے کا لحاظ رکھتے ہوئے مجبور کو نظر انداز کریں تو۔۔۔ میں نے بہت سوچا مگر متان کا قافیہ شیطان کے علاوہ کچھ سمجھتا نہ تھا جو اپنی جگہ برائی نہیں ہے۔ شیطان سے کس کو انکار ہو سکتا ہے اور کس کے ساتھ نہیں؟ اگر متان کو ایک ضمیمہ و شیطان دے دیا جائے تو اس کا مستحق ہے کیونکہ یہاں شیطانوں کی کمی ہے زیادہ سے زیادہ شیطان متان والوں کی ہے یہ ہے کہ ایک آدھ ہزار آکر لینے ہیں اور کسی سے کھلاو دیتے ہیں۔ سائیں! پھر نہ ملو مگر شریف استے ہیں کہ محمد بن قاسم صاحب تھیں بن سونا اور حیر و ہزار دوسو خاک طلا لے گئے اور شیخ اکرام الحق صاحب آج بھی ان کی تحریف کرتے ہیں کیونکہ یہ سونا محمد بن قاسم نے خود استعمال نہیں کیا تھا بلکہ بیت المال کے لیے بھیجا تھا کیونکہ وہاں خراج بہت بڑھ گئے تھے۔ اور آپ جو کچھ کس حساب کتاب وہ ضمیمہ رکھتے تھے ورنہ حیر و ہزار دوسو خاک طلا تو ان بھی کافی جفا کشی کا کام ہے۔ مرعیام نے رہایات متان میں لکھا ہے کہ جس مندر سے یہ سونا برآمد ہوا تھا اس کے چھار یوں سے نکوا بھی کیا تھا اور ان کو ایک باغی میں مندر کی کے علاوہ رسید بھی لکھ دی تھی تاکہ مندر سے۔ یہ رسید تقسیم ہندوستان سے وقت اہل خود سادھ لے گئے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ رسید کسی طرح کنڈوین کے ہاتھ لگ گئی ہے اور وہ ہندوستان سے خط و کتابت کر رہا ہے۔

کا نور و چکا ہے۔ میرے ایک دوست کی بیوی نے ایک دفعہ اپنے مہمانوں سے میرا تعارف اس طرح کر لیا کہ میرے شوہر ان کا بیٹھڑ کر کرتے تھے۔ مدت کے جب میں نے ان کو پہلی بار دیکھا تو اپنے شوہر سے پوچھا کیا یہی ہیں؟ رحم؟ جس سے میں نے قیاس کر لیا کہ ان کے شوہر نے خرد و کوئی رنجی کی بات کی ہوگی۔ اس طرح میرے ایک اور بہت پیارے دوست "جواب خدا کو پکارے ہو گئے ہیں" میرے اردو لہجے کی نقل کر کے مجھے چھیڑتے تھے مگر میں اردو پڑھتا ہی رہا اور مایوس نہیں ہوا۔ اور جن محزم نے کہا تھا کہ کیا یہی ہیں آپ کے رحم؟ ان کی بات میں کچھ شاعرانہ غلط بیانی پائی جاتی ہے کیونکہ کچھ سال پہلے جب انہوں نے اسی واقعہ کا ذکر کیا تھا تو یہ کہتا تھا کہ میرے شوہر کہا کرتے تھے کہ کیا یہی صاحب (رحم نہیں) بہت گورے چٹے دی ہیں۔ لیکن جب میں نے پہلی دفعہ دیکھا تو ان سے پوچھا کیا یہی آپ کے گورے چٹے کیا ہیں؟ انہوں نے کہا اب بتا دی کہ وہ چے کا لے ہو گئے ہیں۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ان کا مطلب سفید گوشتا۔ اور اس کے علاوہ ہم لختیوں کے بھال کا بھی تو مجھ پر اثر ہوا ہے ورنہ آپ کے سر کی قسم اٹھایا نہیں تھا۔

بات یہ ہے کہ میرا اصلی نام چندر مرغان تھا (اور آپ کے فائدے کے لیے یہ بات کہتا ہوں کہ پشاور کے مشہور ڈاکو کا نام مہمان تھا) جب پانچ چھ سال کی عمر میں قلعہ کے موقع پر والد مرحوم نے ہم تین بھائیوں کے لیے بوٹ منگوا لیے لیکن ہمیں جسے باندھنے نہیں آتے تھے۔ والدہ نے سٹارشا والد سے کہا کہ بچوں کو جسے باندھ سکھائیے۔ انہوں نے مذاق کرتے ہوئے کہا "مگر میں تمہارے لیے دوسری ماں لاؤں تو تم اس کو سلام کرو گے؟" بڑے بھائی نے کہا "ہاں" اور والد مرحوم نے ان کے جسے باندھ دیا۔ میری باری آئی تو میں چپ ہو گیا۔ والد نے پھر سوال کیا۔ میرے بھائی نے کہا میں کہا کہ وہ ماں میں کیا ہے۔ جہاں سے سلام سے کچھ جگہ سوتیلی ماں تو نہیں آ جائے گی۔ پر میں نے کہا کہ اگر آگئی تو؟ تیسری بار جب والد نے سوال کیا تو میں نے کہا سلام تو نہیں کروں گا..... میرے جسے کھلے رو گئے اور میں جسے میں باہر نکل آ یا اور رونے لگا۔ اس سے زیادہ کہا کر سکتا تھا۔ والد مرحوم ان دنوں شاہنامہ پڑھتے تھے اور من و گرز و میدان و افرا سیاب والا مصرعہ ان کو نہ پڑھتا تھا۔ میرے لٹھے کے بعد کھٹکھٹا کر فٹے دار کہنے لگے یہ بھی بڑا رحم بنا پھرنا ہے۔ اپنے باپ کو دوسری شادی کی اجازت ہی نہیں دیتا۔"

اس دن چندر مرغان کی بجائے میں رستم خاں ہو گیا اور جب ڈراما منڈب ہوا تو نام کے ساتھ محمد لگا لیا اور خاں کا نام دیا۔ مگر میرے بچوں کے جسے ابھی تک کھلے ہیں۔



ایم آر کیانی کو کوئی بات نہ ہوئی۔ ابھی ہم محمد رمضان کہتے ہیں ابھی ملک رنجیت۔ آپ اپنے ہاتھ سے لکھیں کہ آپ کا اصل نام کیا ہے تاکہ ہمیشہ ہمارے مگر میں آئندہ یہ ہی لکھتا رہوں۔

میں نے جواب دیا کہ یہ خط میں اپنے ہاتھ سے لکھو یا ہوں اور میرا نام محمد رحم ہے اور جس کے بعد ملک کرے وہ کافر ہے۔ نیز چونکہ اس کا احتال ہے کہ اس کے بعد آپ کے مگر میں میرے قدم و قامت پر جھکا اٹھے تو واضح ہو کہ میں خود تو بال سے زیادہ باریک ہوں مگر میری بلڈ اینڈ کوار سے زیادہ تیز ہیں جن پر وہی ہاتھوں کے ٹرک نہیں گزر سکتے اور اسے پر خود اڑا پنا مگر وادوں سے کہو کہ اگر کبھی متعدد ادوار کی نماز پڑھیں تو مجھ لیں کہ "اصدا الصراط المستقیم" کے معنی ہیں۔ کوئی کچھ ایسا نہیں ہے جو کوار سے زیادہ تیز ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ فلاں نے قریبوں کے پٹی باندھ دیے۔ پس یہ بھی اس قسم کا پٹی ہے۔ صرف اس میں قریب نہیں ہیں۔ اور نہ کوئی تیز دھار لوہا ہے۔ اس پر خود اڑنے لکھا ہے کہ یہ باتیں تو میں نہیں سمجھتا بہتر یہ ہوگا کہ آپ اپنی تصویر بھیج دیں۔ تصویر تو میں نے ابھی نہیں بھیجی مگر اس ٹرک کی یہ بات کہ مجھ ایم۔ آر۔ کیانی کچھ معنی نہیں رکھتا ابھی قصور سے دن ہوئے ہیں کہ گینا بات ہوئی آپ کو معلوم ہوگا کہ WHO IS WHO کے نام سے بعض ہابشر ایک ڈائرکٹری چھاپتے ہیں جس میں بقول ان کے مشہور لوگوں کے نام ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ بات مسلمہ ہے کہ وزیر تو مشہور لوگوں کے نام ہوتے ہیں بیج بھی مشاہیر میں سے ہیں اور اگر وہ قصور کے ساتھ روپے بھی بھیج دیں تو حیرت کے منتحق قرار پاتے ہیں۔ پچھلے مضمون اپنی بہتری حیرت کی شجے کے لیے میرے پاس انگلستان سے ایک خط آیا۔ بہتری حیرت میں میرا نام ملک رحمن کیانی دن تھا جو میرے بڑے بھائی کا نام ہے۔ وہ بھی ایم۔ آر۔ کیانی ہیں۔ ان کے دوڑ کے بھی ایم۔ آر۔ کیانی ہیں۔ بہتری حیرت میں میری سیاسی سرگرمیوں کا ذکر تھا اور یہ بھی نکال سال میں میں صوبہ سرحد میں وزیر صحت ہوا جس سے صحت کچھ اچھی ہو گئی مگر 1955ء میں وزیر مواصلات ہوا اور پھر سارے وسیلے گئے اور 1958ء میں سیاست سے تیز اور ہو کر میں چیف جسٹس ہو گیا۔ اللہ سوائے آخری کتاب کے باقی سارے سیاسی گناہ میرے بھائی کے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ میرا ایڈریس پریم کورٹ آف پاکستان لکھا تھا جہاں میرے سامنے کا بھی سانس پھولے لگتا ہے۔

اس لیے میں نے کہا اے وہ لوگو! جو اپنے اچھے کھلے نام کو چھوڑ کر قرآن مجید کی طرح "الف لام میم" استعمال کرتے ہو میرات حاصل کر دو رت کسی دن بغیر تمھارے کے چیف جسٹس یا وزیر بن جاؤ گے۔

دوسرا واقعہ زیادہ نازک ہے یعنی میرا نام رستم خاں رکھا گیا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھ سے پہلے بھی ایک ڈنگی کا نام

سے دماغ رجت ہو جاتا ہے۔ اس بات کی تصدیق کا مجھے تو موقع نہیں ملا کیونکہ میرے کچھنے تک آم بچوں کے پیٹ میں کبھی چکے تھے اور گھٹلیاں میرے لیے محفوظ کر دی گئی تھیں۔ لہذا محاورے کے مطابق ہمارے ہاں تقسیم کار اس طرح ہوئی کہ آم کمانے سے بچوں کو مطلب اور بچل گانے سے مجھے۔ اس طرح آم کے آم اور گھٹلیوں کے دام والی بات بھی سچ ہو گئی۔ القصد سجاد صاحب اگلے دن آئے اور آتے ہی پوچھا کہ کوئی مضمون سوچا ہے۔ میں نے کہا کہ مضمون کیا خاک سوچوں میری پٹلیوں میں درد ہے اور پٹلیاں آسمان کی گھٹلیوں سے ٹوٹیں بڑھیں۔ انہوں نے پٹلیوں کے درد کے لیے کئی نسخے تجویز کئے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ درمغا پر زور ڈالا جائے اور کوئی مضمون لکھنا شروع کر دیا جائے تو پٹلیوں کے درد کا احساس مٹ جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ درد تو میں اور بہت سی بے وقایعوں کی قبرست میں ملا کر بھول سکتا ہوں مگر سول سرجن نے ان کو ایسا مشبوط ہاندھ رکھا ہے، میری پٹلیوں کو میری بے وقایعوں کوئیں درد دہی پٹلیوں کے ساتھ بندھ گیا ہے اور اسی لیے میں غالب کے شعر کس طرح پڑھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔

دل سے نسا تری آجھت دنائی کا خیال

ہو کیا درد کا پٹلی سے جدا ہو جانا

خیر بظاہر سجاد صاحب نے کچھ ہمدردی کی مگر ہمدرد میرے پڑ مر دو چرے کے سیکڑی کو بلا کر انہوں نے پانچ مضمون کھسکوا دیے اور مجھے اقتدار پر یا کہ میں ان میں سے کسی ایک پر طبع آزمائی کروں۔ گویا طبع آزمائی سے مٹری کوئی صورت نہیں اور آپ کے سامنے قوش ہوتا ضرور ہے۔ چاہے پٹلیوں میں درد ہو چاہے آم کی گھٹلیاں چوڑے ہو گئیں۔ وہ کیا کہا تھا کسی قاری شاعر نے ”ظالم بہت ہیں لوگ حیرے شہر کے جاناں“

اب دو پانچ مضامین سنئے۔

- 1- انکار پریشاں۔
- 2- عدل و انصاف کی راہیں۔
- 3- میری زندگی کے چند غمناک واقعات (غلامی نہیں)
- 4- نوادر واقعات۔

5- پاکستان کس طرف اور ساتھ انگریزی میں لکھا تھا

(WHITHER PAKISTAN)

آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

انکار پریشاں (قسط اول)

آج سے دو سال بعد میں پھر آپ کے سامنے قوش ہو رہا ہوں۔ سجاد صاحب سے میں نے عرض کیا تھا کہ اس ادبی مغل سے خائف ہوں اس لیے کہ پہلی قوشی میں (امید ہے کہ میرے پٹے کے قوشی نظر آپ قوشی کے لفظ پر محض نہ ہوں گے) جب میں نے تقریر کی تھی تو آپ سب ایسے خاموش بیٹھے تھے جیسے آپ کے سامنے کسی مقدمے کا فیصلہ سنایا جا رہا ہو خصوصاً خواتین کے چہروں سے تو میں معصوم ہوتا تھا کہ کہ میری تقریر لکھی ہوئی نہ ہوتی تو وہاں لائے خیال واپس لوٹ جاتیں۔ (یہ لائے خیال نیا محاورہ ہے اگلے پاؤں کا ذاتی ہم زلف) اگر فن ادب کے یہ معنی ہیں کہ ادب سے بیٹھا جائے تو میں بے ادب ہوں اور اس لیے ادبی پر آپ و ادب عرض کرتا ہوں مگر سجاد صاحب نے یہ کہہ کر مجھے تسلی دی کہ ایک تو کچھلی قوشی کا مضمون قلمبند تھا دوسرے ان دو سالوں میں میری گستاخیاں کافی مشہور ہو چکی ہیں۔ اس لیے آپ مجھ پر ضرور نہیں گے۔ غرض آپ کے سیکڑی آئے اور پوچھنے لگے ”آپ کو کس مضمون پر قوشی آتی ہے؟“ میں نے کہا ”پہلے آتی قوشی حال دل پر قوشی“ اب اپنے ادبی ذوق کی تعریف پڑتی ہے۔ انہوں نے دل جوئی کے طور پر کہا ”یہ کوئی ناچاری بات نہیں ہے۔ آپ اکبر الہ آبادی کی طرف رجوع کیجئے مگن سہان کے شعراء آپ کے بوسیدہ برہا میں ترمیم پیدا کر دیں۔“ میں نے کہا آپ مجھے شاعروں کی رجوع سے کیوں لڑاتے ہیں۔ زندگی کا ایک حصہ اقبال کے تین شعر یاد کرنے پر صرف ہوا اتنی زندگی میرے پاس کہاں کہ اکبر الہ آبادی کے بھی تین شعر یاد کر لوں۔ انہوں نے فرمایا میں آپ کو چند کتابیں دے دوں گا۔ آپ پڑھئے اور دو چار شعر یاد کر لیجئے۔ اس پر مجھے گولہ مستح کے ایک مشہور کردار کی بات یاد آئی کہ میں اپنی لڑکی کو فریغ خود پڑھاؤں گا کیونکہ سکولوں میں اچھا نہیں پڑھا ہے لیکن پہلے میں خود فریغ سکولوں گا۔ جنس حضور آپ کوئی اور مضمون سوچئے۔ یہ کہہ کر میں تو کوہاٹ چلا گیا اور اس امید میں رہا کہ اکبر الہ آبادی کے بعد نہ انہیں کوئی مصنف ایٹ آبادی ملے گا جس کی شاعری پر مجھے تنقید کرنی پڑے اور نہ مجھے تائید میں مگر واپس آ کر کیا دیکھتا ہوں کہ چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں صاحب صدر میاں کورٹ کوٹا لاکر لاہور سے ایٹ آبادی پہنچے ہیں۔ نیز ایک عدو کو آسمان کا بھیجا ہے۔ انہوں نے شاید کہیں پڑھا ہو گا کہ آسمان

یہ پہلا مضمون تو میری پریشان حالی کو دیکھ کر تجویز کیا گیا تھا۔ ایسٹ آف کینڈا صاحب نفس شناس کے علاوہ نبض شناس بھی ہو گئے ہیں۔ آپ نے یہ دیکھ لیا ہوگا کہ اب بھی کتب میں اپنے افکار پریشان کو قبیح کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں جو آدمی کی عقلیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں اور اللہ اللہ مضمون کے اثر شب آپ کو پریشانی میں مبتلا رکھوں گا۔ آپ نے کافی آرام کے دن کاٹے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد آپ کو اس قصے نے بھی پریشان نہیں کیا کہ ”گھوڑا دھڑا دھڑا“ یا یہ کہ سرت روگنی اور حیر کام آئی۔ گاڑی دراصل وی رسی صرف انجمن بدلا۔ ٹینٹ پکٹ والے بھی وی رہے اور ٹکٹ دیکھنے والے بھی۔ آپ نکت خرید کر ستر کرتے رہے۔ گاڑی ابست ہوگئی یا پھر آپ کے افکار بھی پریشان نہیں ہوئے بلکہ آپ نے افکار کو اپنے نڈے دیک ہی نہیں آنے دیا تاکہ بے وجہ پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔ آپ کے سر کی قسم آپ میں بہت صبر ہے۔ اگر میں آج آپ سے بارہ سال کا بدل نہ لے سکتا تو اس کی وجہ یہ ہوتی کہ میرے افکار تو شریعی سے پریشان رہے۔

ان مضمون تو میں نے مولر گاڑی میں بیٹھ کر لکھا تھا۔ لاہور سے آ رہا تھا اور یہ اچھا موقع تھا کیونکہ سوائے ڈرائیور کے اور کوئی پریشان خاطر ہی کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر ڈرائیور نے بھی پریشان کیا۔ ایک گدھے سے جو اچھا بھلا سڑک کے درمیان جا رہا تھا نگر لگا دی جیسے پہلے اس کے راستے میں گدھے نہیں آتے تھے۔ ہمارے تجربے میں تو بہت گدھے آئے ہیں۔ اور ہر گدھا سڑک کے درمیان چلتا ہے یہ قریب سوئیں تو آخر گدھوں ہی کے لیے ہیں۔ ڈرائیور میں یہ نئی بات دیکھ کر گدھوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے خود مولر ہاتھ میں لے لی۔ تو ڈریور نے گدھے سے کہ ایک اور گدھا جس کی عقل و صورت ہماری ہی طرح کی تھی بالکل سامنے آ گیا۔ اس سے مولر بچانے کی فرض سے میں نے پیڑور سے گھما لیا تو مولر شیطان کی طرح چٹکی کی میری تخلیق آگ سے ہوئی ہے اور اس شخص کی مٹی سے اور جراثیم ہو کر استقامت سڑک سے باہر نکل گئی جیسا بی ڈیوڈی کے کارکن مٹی نکال کر چھوٹے چھوٹے گڑھے بناتے ہیں تاکہ اگر کسی کی مولر سڑک سے باہر نکلے تو اچھی طرح سے گرے۔ چنانچہ ہماری مولر پھسل کر پہلے ایک گہرائی میں گری پھر اچھل کر دوسری میں اور پھر تیسری میں۔ خدا جانے اس کو بی۔ ڈیوڈی سے کیا دشمنی تھی۔ معلوم ہوتا ہے جیسے ان گدھوں میں گھسے کی گہرائیاں تلاش کر رہی ہو۔ آخر جب کوئی بھی نہ ملا اور میرے ہائیں پہلوی پہلیاں بھی نہ کھینکے اور گہرائی بھی اور کوئی نہ رہی تو ایک جھماڑی میں غصہ مگر۔ لوگ جمع ہوئے اور کسی نے کہا آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ بچ گئے۔ میں نے کہا خوش قسمت کیا ہوں میں تو آدمی کی عقلیوں اور ایسٹ آف کینڈا کے خیال میں غرق تھا جنہوں نے میری گاڑی کو اس جھماڑی تک پہنچا دیا۔ اب کے میری گاڑی یہاں سے نکال دو پھر کبھی شہر نہیں کہوں گا۔ مگر جب ایسٹ آف کینڈا کے خیال میں پہنچا تو سڑکی پریشانی

بہل کیا اور پھسل نے کر گھینے چڑھ گیا۔ ابھی تو ڈرائیور کا تھا کہ جسم کے اوپر ایک لطیف حرکت محسوس ہونے لگی اور پھر کھلی ہونے لگی۔ حتیٰ کہ کپڑے اتارنے پڑے۔ دیکھا تو دو عدد وکھل اپنے حسن معیت کا اظہار بلکہ مظاہرہ کر رہے تھے۔ مگر میں نے کہ آپ جانتے ہوں کہ مکھل کیا چیز ہے کم از کم میں نہیں جانتا۔ شاید وہ بھوں۔ بہر حال مجھ نہیں تھے۔ مگر بھی آپ نے سوچا ہے کہ صرف دو مکھل ہی ایک ہرے ملک کو کیا پوری دنیا کے سیاہی جسم کو کٹ کٹ کر چھو کھوند بٹاتے ہیں۔ کبھی وہ ہڈیوں کر بھی آ جاتے ہیں۔ لیکن میں یہ امتیاز نہیں کر سکتا کہ وہ مکھل ہیں یا نہیں۔ میں تو صرف مجھری شناخت کر سکتا ہوں اور اس لحاظ سے میں محمد زراعت والوں سے بہتر کہ میں ہوں جو تہذیب فارم سے خاص طور پر درختوں کا معائنہ کرنے کے لیے ایسٹ آف کینڈا آئے ہیں تو سب اور ہڈام سے متعلق تو کوئی رائے دے نہیں سکتے البتہ آڈو کو پہچان لینے ہیں۔ بات یہ ہوتی کہ میں نے کوئی آٹھ برس ہوئے یہاں بھگت سب غریبی اور بھگت کوٹے کاشت کروائے جن کے پھل دینے کا وقت آچکا تھا مگر غریبی کے سوا باقی درختوں کا رو بہ دیا ہی لا حاصل نظر آتا ہے جیسے محمد زراعت کا۔ میں نے یہاں کے مقامی افسر سے امداد طلب کی۔ دو سال ہوئے میں نے ڈینی کشر کی وساطت سے زراعت والوں کو اپنے درختوں کی بچاؤ کی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ آپ پڑھتے رہے ہوں کہ سرکار کو کون کون شوق والائی ہے کہ محمد زراعت کے ماہر اند مشورے سے فائدہ وادھیں مجھے بھی شوق ہوا ڈینی کشر صاحب نے محمد زراعت کو اطلاع دی۔ ایک آدمی جو اپنے کو مقامی فرسٹ سپیشلسٹ کہتا تھا آڈو میرے انکیت سے کہنے لگا کہ ڈینی کشر کو اطلاع دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اوپر سے ہاؤڈالنے کا کیا فائدہ۔ تم اور میں کہیں کے آدمی ہیں مجھ سے ہی کہہ دیجئے۔ چنانچہ اس حکایت کو قبیح کرنے کے لیے دوسری دفعہ میں نے خود مولر سڑک کے کنارے کھڑی کی جہاں انسپکٹر زراعت کا دفتر ہے۔ میں دفعہ ایسا کیا۔ انسپکٹر صاحب تو تینوں دفعہ نہیں تھے کہیں کام پر گئے تھے دوسری سپیشلسٹ ملا۔ وہ ایک دفعہ آیا بھی اور اس نے بڑا بے جا مشورہ دیا۔ سب سے درختوں کو دیکھ کر کہا کہ ان کو کھاد دو اور غریبی کی ہم وقت پر کٹائی کر لیں گے۔ میرے انکیت نے کہا مگر سب تو شاید جنگلی ہو چکے ہیں یعنی بیجوں کے بیجے سے آگے ہیں۔ سپیشلسٹ نے کہا جنگلی تو ضرور ہیں۔ میں نے کہا کہ تو پھر جنگلی درخت سے کیا فائدہ؟ اس نے کہا یہ بات تو ہے۔

اس کے بعد میں نے پوری کے درخت دکھائے جن کے پتے کسی کپڑے کے کھالے تھے مگر کیکڑا کا ب تھا۔ اس نے کہا یہ ایک کیکڑا ہے جو پتے بھی کھاتا ہے اور بھاگ بھی جاتا ہے۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ کیکڑی ایک پرندہ ہے جو بیٹڑوں میں رہتا ہے اور ننگ رہنے کھاتا ہے۔ اس سے بھڑرائے تو سپیشلسٹ کے لیے یہ ہوتی کہ وہ پتے کھانے والی چیز ایک پرندہ ہے جو مر رہے کھاتا ہے۔ میں نے پوچھا آخر اس کا علاج کیا ہے؟ کہا علاج ایک قسم کا زہر ہوتا ہے جو درختوں پر چھڑکا جاتا ہے اور جسے کھا کر

کیزے سے مر جاتے ہیں گر آپ تو یہ بھی ضروری نہیں ہے اس لیے مغرب کیزوں کا موسم گزر جائے گا اور اسی لیے شاعر نے اس مہوار کیزے کی طرف سے کہا ہے "چارہ گرم نہیں ہونے کے جوڑ میں ہوگا"

اور اسے اہل بصیرت دیکھو کہ موسم کے رد و بدل میں تمہارے لیے لٹا نیاں ہیں۔ آئندہ سال بھرچے نہیں گے اور بھر کیزے جوں کو کھالیں گے اور درختوں پر زہر چھڑکنے سے پہلے بھر کیزوں کا موسم گزر جائے گا لیکن زراعت کا علم کسی طرح برقرار ہے گا۔ جب میں نے اپنے فیصل ڈائنکر زراعت کو اپنے درشتوں کا حال زار بتایا تو انہوں نے کہا کہ آپ غلط کریں میں تباہی کا دم سے کہہ بکھار لوں گی سچ دوں گا۔ یہ لوگ وعدے کے مطابق 24 اگست کو آئے۔ جن بکھار ماہر۔ انہوں نے سارے حالات سن کر رائے دی کہ ہم ڈوٹی سے نہیں کہہ سکتے کہ کون سے درخت جنگلی ہیں شاید نوے فیصد جنگلی ہوں۔ بات یہ ہے کہ ہم اپنے فارم کے متعلق زیادہ جانتے ہیں۔ سبب اپنا دم (اور مکمل) وہاں نہیں ہوتے۔ باقی رہا کہ گوشت و زراعت والوں نے اب چھوڑ دی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر درخت چل نہیں دیتے تو جنگلی ہوں یا صحرانی ان سے کیا فائدہ؟ کاٹ کر پیچک دیں۔ میں نے کہا کہ اسی لیے تو آپ کو تکلیف دی ہے کہ آپ وہ درخت یا نٹ کریں کہ درشتوں میں چل سکیں نہیں آتا۔ تاکہ آٹھ سال کی محنت برباد نہ ہو۔ چل نہ آنے کی وجہ تو نہ بتا سکتے ایک صاحب نے گہرا سانس لیتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ یہ سب بھی عجیب مخلوق ہیں۔ آٹھ سال میں تو کر دیتے ہیں لیتے ہو سکتا ہے کچھ عرصہ بعد چل و پھار شروع کریں۔ میں نے بھرپوری کے کرم زدہ بچوں کی طرف توجہ دلائی۔ انہوں نے کہا یہ ایک بھونڈا جرات کو آتا ہے اور سو رہے چلا جاتا ہے۔ طاق؟ طاق؟ یہ ہے کہ کوئی زہر چھڑکا جائے جو پیٹ میں درد پیدا کرے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ ایسے آبادی کی کشتی کا پانی ان پر چھڑکوں جس سے ضرور پیٹ میں درد ہوگا" "بادریا میں پانی کا دوا ہو جاتا"

جو لوگ پشاور سے ایسے آباد آتے ہیں ان میں سے بعض کے پیٹ میں تو خلیاں پھینکتی ہی گزرتا بہت شروع ہو جاتی ہے۔

میں نے ان ماہروں کو رخصت کرتے وقت کہا کہ آپ نے ناقص تکلیف کی۔ آپ تو جانتے تھے کہ آپ نہیں جانتے۔ آپ نے یوں ہی زحمت اٹھائی۔

لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ اہل زراعت کے افکار رائے آباد میں ہی پریشان ہو گئے تھے۔ یہ کہات میں بھی پریشان رہتے ہیں۔ ایک انگریز لیگل اسسٹنٹ سے میں نے پوچھا کہ فلاں گاؤں میں میں نے ایک نیا کنواں کھدوایا ہے وہاں کپاس کیسی رہے گی؟ اس نے کہا کہ کہات کے ضلع میں کپاس نہیں ہوتی۔ میں نے کہا مگر ہماری پرانی زمینوں میں تو ہوتی ہے۔ اس نے کہا بھر کا شت

کردیں۔ ایک اور شخص کو جو پھلوں کا ماہر تھا میں نے کہا کہ ایک مالے کو پکڑ لی گئی ہے پتے سکر جاتے ہیں اور پھل چھوٹا آتا ہے۔ اس نے کہا میں جا کر ٹھیک کر لوں گا مگر وہ نہیں آیا۔ میرے ایک بچے سے اس نے بہت رازدارانہ انداز میں کہا کہ میں اپنے منکر کے خلاف رٹ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مطلب کیجئے؟ میں نے سمجھے سے کہا۔

حاجت بنانے کو آیا تھا بائی
حاجت بنانے کی باگی رضائی

مگر اس نے تو حاجت سے پہلے باگی رضائی۔ بہر حال صرف ایک مالے کے درخت کے بدلے تو کوئی رٹ نہیں جیت سکتا۔ اور یہ ہیں عدل و انصاف کی راہیں جن کے متعلق آپ کے سیکرٹری نے مجھے تقریر کرنے کا اختیار دیا ہے حضور! جب بھی ان لوگوں کے انصاف کا تقاضا ہے تو ہم سے کیا عدل و انصاف کی راہوں پر حادے نہیں ہوں گے؟ بعد میں وہ پھلوں کا ماہر جواد مرشل اکا کاٹکار ہو گیا یعنی سکرین ہو کر برطرف ہوا اور میرا لانا سوکھ گیا۔ اب ہمارے دلوں میں کوئی کدورت نہیں رہی۔ ہم دونوں کے دل صاف ہو چکے ہیں۔" "تو بے دل پکڑ میں چلاؤں ہائے چل"

اور وہ انسپلر زراعت جو تینوں دفعہ دفتر میں نہیں تھے اور کام پر گئے ہوئے تھے انہیں بھی اتمام حجت کے لیے میں نے خط لکھا مگر وہ بھی شاید ان کے پیچھے پھرتا رہا کیونکہ وہ نہ آئے۔ اس پر مجھے ایک عزیز یاد آئے (مجھے اس قسم کی یادیں اکثر ستاتی ہیں) وہ عزیز غمگینا ہمارا ہیں اور سبھی بچے ہمیں گھنیں دن گھر پر رہتے ہیں باقی وقت دوروں پر۔ اپنے ہاتھوں سے کہہ رکھا تھا کہ اگر کوئی بڑا افسر میری فیور ہو جی میں شمال کی طرف سے آئے تو کہنا جنوب کی طرف گیا ہوں اور اگر جنوب کی طرف سے آئے تو کہنا شمال کی طرف گیا ہوں۔ مغرب کو وہاں بھی قبو تھا اور مشرق سے سورج لگا تھا۔ اس لیے یہ درخ بتانے سے گریز کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ افسر آئے ایک شمال کی طرف سے ایک جنوب کی طرف سے ناقص سوچ میں پڑ گیا کہ اب میں کیا کہوں۔ غوراً عزیز کوٹارہ یاد۔

NOTRH SOUTH DARK CLOUDS WHICH SIDE NOW

یعنی شمال اور جنوب کالی کتا میں ہیں اور اب کس طرف کا نام لوں؟

لطیف یہاں غم ہوتا ہے لطیف بنانا ہوتا انسپلر صاحب سے پوچھنے لیکن اگر آپ نے "انوار کشتی" پڑھی ہو تو آپ کی مشکل حل ہو جائے گی کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ جب راجہ نے وزیر سے پوچھا کہ اگر انجان ایک اہل زراعت پر سوال کرے اور اہل زراعت کو خود بھی جواب کا پتہ نہ ہو تو کیا کرنا چاہئے۔ اس نے کہا "مگر نہ شیدہ دکھائیے گا؟" کیا تم نے گاما کا قصہ نہیں سنا؟ گاما ایک

دوران دو گاؤں کے جاہل لوگوں میں ایک ہی سیاق تھا۔ جب بھی ان کو کوئی اہم مسئلہ پیش آتا تو کہتے چلا گام سے پوچھ آئیں۔ گمانے سڑکی گئے تھے بہت کچھ دیکھا تھا اور بہت سی چیزوں کے نام بھی اپنی لال کتاب میں لکھ رکھے تھے۔ ایک دفعہ گاؤں میں ایک مینڈک کا پیچلے کسی نے مینڈک نہیں دیکھا تھا۔ ان دنوں مینڈک شہر میں رہا کرتے تھے۔ کبھی کوئی جری مینڈک واسکوڑے گاما کا سمفرن کر کسی نئی دنیا کو معلوم کرنے کے لیے گاؤں کا رخ بھی کر لیا کرتا تھا۔ ہاں آپ کو معاملہ نہ ہو جس گاما کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ واسکوڑے گاما کے خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ لوگ گاما کے پاس گئے اور مینڈک کے بارے میں سوال کیا۔ اس نے اپنی کتاب نکالی اور لوگوں سے کہا کہ میری کتاب کے مطابق پیچلے چلتی ہے یا ضرور۔

مکمل ہے آپ نے گاما کا قصہ اور طرح سے سنا ہوگا "انوار کبلی" میں ایسا ہی لکھا ہے۔ میں نے خود نہیں پڑھا مجھے بھی گمانے بتایا ہے۔ بہر حال وہ ناس گاما کی قسم کے ہوتے ہیں اس لیے اگر آپ والا گاما کوئی ڈپ پٹیلے والا پہلوان ہو تو میرا ایک تعلیم یافتہ اہل زراعت ہے۔ کبھی کبھی وہ ڈاکٹر یا انجینئر بھی ہوتا ہے مگر اس دفعہ ان گاموں کی باری نہیں ہے۔ اس لیے اس جانب میں آپ کے افکار کو پریشان نہیں کروں گا۔

ایک زمانہ تھا کہ میں خود بھی گاما کا مقبلی حکومت کا قانونی مشیر تھا۔ جب بھی حکومت کسی مشکل میں ہوتی تو مجھ سے مشورہ طلب کیا جاتا تھا۔ دکانو کا کانفرنس ہوا کرتی تھیں۔ دکانو کا کانفرنس دوسرے تیسرے روز۔ اب بھی ہوا کرتی ہیں۔ دیکھ لڑی دزیر گورنر مبنی قلمی رائے دیتے ہیں۔ تصویریں لی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی تصویر لینے والے کو غلطیہ دے جانے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ تاکہ میں اس وقت تصویر لے جب ہم گول میز پر زور سے ہاتھ مارتے ہیں۔ اور لوگ اخبار میں دیکھیں کہ کتنے زور کی رائے دے رہے ہیں۔ مجھے چونکہ قانونی طور پر رائے دینی ہوتی تھی اس لیے اکثر خاموش رہتا۔ ایک تو اس لیے کہ مجھے خود کو مل ہوتا تھا۔ خصوصاً جب پریس ایکٹ کے بارے میں مجھ سے سوال کیے جاتے۔ "چھاپہ فرمائے کیا پٹی صاحب۔ یہ قیام اخبار بہت ٹھک کر رہا ہے۔ اس کا کیا تدارک کریں؟" میں "کہنا" ضمانت خیر کہیجئے۔ "وہ پوچھتے کہ اگر اس نے ہائیکورٹ میں درخواست دی تو پھر؟ میں کہتا درخواست تو ضرور ہوگی۔ وہ پوچھتے پھر کیا کریں؟ میں کہتا کہ پھر ضمانت خیر نہ کیجئے۔ دیکھیں انہی اگلی رائے دی۔ سانپ بھی نہ ٹوٹے اور لاٹھی بھی نہ مرے۔ بات جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں ختم ہوتی تھی جیسے گھوڑا دوڑ بھاگ کے تھکاں پروا نہیں آ جاتا ہے۔ اور ہاں یہ قیام پروا نہیں آنے کی بات پر مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ آپ حیران ہوں گے کہ لوگ ہم سے کیسے کیسے قانونی مشورے مانگتے ہیں۔ میرے ایک عزیز کی بیوی نے پوچھا اور پوچھا بھی خط لکھ کر کہ آپ مقدموں کے فیصلے تو کرتے ہیں ذرا مجھے بھی ایک قانونی مشورہ دیجئے۔

میری ایک کنبلی کو اپنے خاندان کے چال چلن پر عرصے سے ٹھک تھا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ وہ ایک آٹھ برس کی لڑکی سے جو گھر میں نوکری تھی چھڑ چھاڑ کر ہاتھ آیا۔ آپ کے قانون میں مردوں کو تو اجازت ہے کہ اگر بیوی کو کسی غیر مرد سے اعتقاد کرتے دیکھیں تو اسے جان سے مار دیں۔ میری کنبلی پوچھتی ہے کہ اگر مجھے موقع ملے تو کیا میں بھی اپنے خاندان کو جان سے مار سکتی ہوں۔ بہت جلد جواب دیں۔ میں نے پڑھا تو پیسے آنے لگے۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کوئی قریب تو نہیں ہے۔ کہیں کسی اور نے خط پڑھا یا تو مشہور نہ کر دے کہ میں لوگوں کو گل کے مشورے دیتا ہوں اور گل بھی ایک عورت کا۔ وہ زبانی پوچھتیں تو شاید صلا بھی دیتا جیسے سیشن بھی کے زمانے میں ایک دفعہ کسی کو صلا دی تھی۔ وہ قصہ بھر کبھی سناؤں گا۔ مگر سیشن بھی کے زمانے میں قتل کی صلا دیتا اور بات ہے۔ کسی سر ملے پر کھینچ کر انسان کی طبیعت میں اصلاح آتی چاہئے۔ دوسرے یہ کہ بذر بیڑا کگل کا مشورہ دینا کوئی مرادگی ہے یا اس قسم کا مشورہ لینا کہاں کی انسانیت ہے؟ اس طرح کی راز کی باتیں تو صرف کسی مجلس اب میں ہی کی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ میں نے نہایت احتیاط اور دانش مندی سے جواب دیا۔ آپ نہ حیران رہ جائیں گے کہ دیکھیں اس قدر دانش مندی ابھی تک موجود ہے میں نے کہا کہ آپ کے دفتر میں مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ آپ کی کنبلی کا نہیں آپ کا اپنا ہے۔ اگر آپ جیسی اہل رنٹ کا خاندان بہت سال لڑکیوں سے چھڑ چھاڑ کرتا ہے تو وہ بہت نا لائق ہے۔ اس کو ذرا غبر جانا چاہیے تھا میرے آپ غلط بھی ہیں کہ مردانہ حالات میں عورت کو گل کر سکتا ہے البتہ مرد کے لیے کچھ غیرت کا معاملہ ہے جو عورت کے لیے نہیں۔ بلکہ اس کو تو فرم کرنا چاہیے کہ آٹھ برس سے زیادہ عمر کی لڑکیوں کی طرف اس کا خاندان دیکھتا نہیں جسے جب تک وہ خود اس کی طرف نہ دیکھیں۔ اس کے علاوہ قتل کرنا اقدام کا ایک فرسودہ طریقہ ہے اور فرسودہ چیزیں عورتوں کو زیب نہیں دیتی۔ طرز جد یہ ہے کہ عورت اگر خاندان کو کسی کے ساتھ چڑ چھاڑ کرتے دیکھے تو نہ پر تھیرا رہید کر دیتی ہے۔ میرے ایک دوست کے ساتھ ایسا ہو چکا ہے مگر یہ نہ کہنے کے میں بھی دوست کے پردے میں آپ یقینی بیان کرتا ہوں۔ یہ جد یہ طریقہ ہے اور روایتی طریقہ وہ ہے جو سز سٹیں MRS PEPPYS نے اختیار کیا تھا۔ اس نے اوپر کی منزل سے دیکھا کہ اس کا خاندان نیچے نوکرائی سے چار کر رہا ہے۔ اوپر سے چلائی "سبا کر رہے ہو؟" پرانے لوگوں میں سختی مضعداری تھی۔ دیکھو جی جی کہ کیا کر رہا ہے مگر پھر بھی خاندان کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقعہ یا۔ خاندان بھی کوٹھے والے ہو تے تھے۔ آج کل کے دوسرائی دار نگاہیں جو گھر ابھرتے ہیں وہ ان کی صفائی پیش کرنے کا موقعہ یا۔ مکان بیوی کے نام بہرہ دیتے ہیں۔ ہاں اگر گھٹس بھٹا نے کسی شخص سے ایسا کرتے تو ایک بات ہوتی اور میرا کبھی ارادہ ہے۔ یہی کوئی بات ہے کہ مکان کرانے پر بھی نہ دیا ہو تو فرضی کرانے پر گئیں وہ۔ وہ چڑ چڑ آپ کے پاس نہیں وہ ان کے گھر ہوئی؟ ہمارے خاندان

میں فرضی باتیں اس قدر آگئی ہیں کہ ہم محض تصنع کے ذریعے بن کر رہ گئے ہیں اور اس لیے اپنی حکومت سے بھی فرضی باتیں کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ خبر سز ہے کہ اصل انسان تھے۔ انہوں نے بی بی کی آواز سننے کو اپنی طرف دیکھا ہی نہیں۔ جس لڑکی کو بیکار کر رہے تھے اس سے فوراً کہا نہ کھلو۔ نہ کھلو۔ لڑکی نے حیرت سے منہ کھولا۔ کہا اور نہ کھلو اور نہ کھلو۔ تو ہمیں صاحب نے کہا اور تہہ دار لگا تو بہت خراب ہے۔ میں یہی سمجھتا تھا۔ جہاں آواز سے پتہ چل رہا تھا۔ پھر سکتا ہے تو نے بی بی کی طرف اوپر کو دیکھا اور کہا "دارنگ! اس لڑکی کے گلے تو بہت خراب ہیں اس کا علاج نہ کرو۔" بی بی نے سمجھ لیا کہ کہا "مگر تم تو اس کے ہونٹوں کو بیکار کر رہے تھے۔" ہمیں صاحب نے بڑی سادی سے کہا "دارنگ! میں تو اس کو لگاؤ دیکھ رہا تھا اس کے ہونٹ بھی میرے ہونٹوں سے لگ گئے ہوں گے۔" اس کے بعد ابھی خاصی لڑائی ہوئی۔ تو تو میں میں دو دو ہال آ کر دونوں فرضی ہو گئے اور پردہ اس طرح گر جس طرح گرا کرتا ہے (مگر میں نے اس خاتون کو لکھا) محترمہ! میں تک نہ قدم طرزی کی بیویوں نے اور نہ جدہ طرزی کی بیویوں نے خاندان کی لب فوازی پر پھول یا بھرا ڈالا ہے اور آپ یہ کہتی ہیں کہ جب موقع ملے تو خاندان کو مار دیا جائے۔ آپ کو مارنا ہی ہے تو شہسبکی حالت میں مار دینے کیلئے وہ قانونی حیثیت سے فوری جذبہ کے تحت آ جاتا ہے۔ مگر یہ آخری بات میں نے خط میں نہیں لکھی۔ یہ تو آپ کو بھید راز بتا رہا ہوں۔ ہاں یہ لکھا کہ اگر آپ نے خاندان کو ماری دیا تو مرد و عورتیں بھی آپ کو چڑیل کہیں گی کیونکہ عورت کی لطافت کے ساتھ خون کا تصور نہیں ہوتا۔ آنسوؤں کا تصور یاد دہیز دیتا ہے وہ آنسو جو عورت سے آنکھوں سے پلپ کر رہے ہوں اور جنہیں خاندان کی طرح ذہن پر نہ گرنے دیے۔ "میں انہد سے ہر گز شہلا کر تھیں"

میں نے بات گھڑے کے قہان پر واپس آنے سے شروع ہی کی تھی۔ خاندان بھی ایک جسم کا گھڑا ہے کہ قہان پر آنے کے بغیر نہیں رہتا۔ تو اسے ناک بیچو! جب تمہارے گھڑے قہان پر واپس آئیں تو ان پر بڑا دوسال نہ کیا کرو۔ مرد و عورت چار پائے ہوتے ہیں بشری چار شاہد ہیں کہ نالے۔ شادی بھی ان کی جائز ہوتی ہے اور بھی نہ جائز۔ ان نا پاؤں کی یہی سزا کافی ہے کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اور جب نام ہو مگر وہ واپس آئیں تو ان پر بے جا سوال نہ کرو۔ یہ بے طریقہ عدل و انصاف کی راہ و صوبہ نہ کا۔ جہاں تک بی بیوں کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ میں نے ابھی راہ نکالی ہے کیونکہ وہ خاندان بہت سالہ کوثرانی کے جہان ہو جانے کے بعد بھی زندہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے پاس کون سی عدل و انصاف کی راہیں ہیں؟ کچھ تو قانونی رکاوٹیں ہیں کچھ رکاوٹیں ہم خود پیدا کر لیتے ہیں۔ جیسے کہی وکیل کو خوش کرنے کے لیے ہم عزم انتہائی جاری کر دیتے ہیں۔ ایک دفعہ جب میں سٹیج پر تھا۔ ایک شخص کا مقدمہ مذاکر

الیا ہو نے کی وجہ سے خارج ہوا۔ اس نے کہا یہ عدالت تو نہ ہوئی۔ میں نے سچی سے جواب دیا سچی میرے دل میں تھی نہ زبان پر نہ تھی اور سچی کا سب یہ تھا کہ میں بے اختیار قہا میں نے کہا کہ کہتا ہے کہ یہ عدل و انصاف کی جگہ ہے تو بکھری ہے۔ اور آپ ہمیں جاننے کے لیے میری عدالتی زندگی اسی عدالت اور کچھ میں تو ان کا قائم کرنے پر صرف ہوئی ہے۔ ہائی کورٹ میں جس کو لوگ عدالت عالیہ کہتے ہیں اگر کبھی ایسی کوشش میں نے کی مگر خیر ان کوششوں کا ذکر چھوڑ دیتے۔ ہم تو ابھی تک عدل و انصاف کی چنگیز پر چل رہے ہیں۔ شاہراہیں تو لی ہی نہیں۔ شاہراہوں تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اور ہم مل کر کوشش کریں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں دیانت داری سے کام لیں۔ دفتر میں باتوں سے زیادہ کام کریں۔ مل چلا جائے تو زمین کو زانو نہ کھدیں۔ لوگوں کو پڑھانا ہو تو اس طرح پڑھائیں کہ چھٹی کے دن بھی وہ دھارے کے خواب دیکھا کریں۔ "مجھے بکجب آ اور طفیل گریز پائے را"

یاد آجیکہ دیوانی عدالت کو لکھتے جس نے عمر کو قصہ میری کے ساتھ طلب کیا ہو۔ عمر پڑھاری پہلے تو آتائیں۔ جب آتا ہے تو بغیر قصہ میری کے۔ اس موقع پر عدالت میں پارہا کی تاریخ نوے کیلئے قصہ میری سامنے رکھنا ضروری ہے اور عمر پڑھاری آدھ گھنٹے میں جا کر لاسکا ہے اور کیا کیا کہوں۔ جس انگریز ڈپٹی کمشنر نے مجھے سروں کے ابتدائی مراحل سے نکالا وہ کہا کرتا تھا کہ ہندوستانیوں میں (اس وقت ہندوستان واحد تھا) یہ بڑا نقص ہے کہ کوئی کام نہ اٹھاکے نہیں کرتے۔ ان کی تو جہت سستی اور سرسری ہوتی ہے۔ اور میں اپنے محدود طبقے میں یہی تلقین کرتا رہا ہوں کہ یا تو کام نہ کرو گی نہیں اور اگر کرتا ہے تو ابھی طرح سے کرو۔ جس سعادت مندوں نے میری نصیحت سنی ہے انہوں نے میری ہدایت کے پہلے حصے پر عمل کرتے ہوئے سرے سے کام نہ کیا ہی چھوڑ دیا ہے۔

مگر میں وہ اعتنا رنگ اختیار کرتا رہا ہوں۔ آپ مجھے اور جو کچھ چاہیں سمجھیں لیکن یہ چین رکھیے کہ میری نفسیاتی زندگی چند صحت سے دور ہے۔ میری زندگی کے نفسیاتی واقعات جن کے متعلق آپ کے تکراری صاحب نے بے چارے دی ہیں وہ آپ کو سنا چکا ہوں اور جو اس قسم کے افکار پریشان میں اٹھے ہوئے ہیں اور ابھی تک ایسا کوئی بڑا معرکہ نہیں کرتے تو اسے اور واقعات میں سے تصور کر کے آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ انہیں چھوٹی چھوٹی تکراری باتوں کو لے کر تاراج نہ پائی جاسکتی ہے۔ میرے لیے تو خواہات کا سامان خریدے ابھی ایک نفسیاتی واقعہ بلکہ ایک اچھا خاصا حادثہ بن جاتا ہے۔ پچھلے مہینے میں انارکلی میں شیخ متا بہ اللہ ایسٹریزکی دکان پر گیا کہ چھامٹ کے پانی کے لیے ایک پیالی خریدیں۔ اس کی ضرورت اس طرح محسوس ہوئی کہ میری پرانی پیالی بہت پرانی ہو چکی تھی جو 1934ء میں خریدی تھی۔ پچھلے سال مئی کے مہینے میں رحمن صاحب اور میں کراچی میں ایک ہی جگہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ رحمن صاحب چونکہ میرے دل میں رہے ہیں اس لیے ان کا ذکر زبان پر آ ہی جاتا ہے۔ آپ کو کہیں غلط محسوس نہ ہو اس لیے یہ

میں میں شملہ گیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پاکستان بننے سے پہلے کا وہ زمانہ کس طرح ہنگاموں سے پر تھا۔ قائد اعظم بھی کسی کا فرائض کے مسئلے میں وہیں تھے۔ مدت سے میری آرزو تھی کہ قائد اعظم سے ملوں۔ چنانچہ میں راکشاش چند کران کے مکان پر گیا۔ اگر میں آپ سے کہوں کہ جب میں ان سے ملا تو میں نے انکو ایک منہ پر مشورہ دیا جس پر انہوں نے فرمایا کہ آپ مجھے دو سال پہلے ملے ہوتے تو پاکستان پہلے بن گیا ہوتا آپ ہاں میں لیں گے اور کوئی لوگوں نے آپ سے ایسی باتیں سنوائی ہوں گی کیونکہ قائد اعظم تو اب ان کی تردید نہیں کر سکتے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب میں ان سے ملنے گیا تو وہ مجھ سے نہ ملے اور میرے دل میں ان سے ملنے کی حسرت رہ گئی۔ میں نے ان کے سیکرٹری کو بتایا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس نے پوچھا کوئی کام ہے۔ میں نے کہا کام تو کچھ نہیں صرف تمنا ہے زیارت کھینچ کر لائی ہے۔ اس نے کہا پھر وہ آپ سے نہیں ملیں گے۔ میں نے کہا آپ میرا کارڈ ملے جائیں۔ میرا خیال تھا کہ آئی سی۔ ایس اور کچھ کروہیہ کچھ جائیں گے جنھیں شاعر نہیں ہوں جو وہ ادیب اور پھاڑوں میں جھلکتے پھرتے ہیں۔ "اتھو کوٹ والا تھوٹوں" اور جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں مگر کیا کیا پتہ سیکرٹری نے کارڈ دکھایا نہیں اگر نہیں دکھایا تو خدا سے نہ بچنے والوں آ کر اس نے میرے کارڈ کے ساتھ مجھے بھی واپس کر دیا۔ میں باہر لپک کر ایسا محسوس کرنے لگا جیسے کسی نے کہا کہ اے تم کو فوری سے ڈاکس کر دیے گئے ہو۔ کچھ دیر کھڑا ہوتا کہ میں سر میں جو چٹکری کیفیت تھی اس پر قابو پاؤں پھر راکشاش کی طرف چلا۔ اسے میں میں نے دیکھا کہ راکشاش میں سواری کوئی ان کے گھر سے نکلا۔ اخبار میں جو قصہ میری لکھا کرتی تھیں ان سے میں نے پہچان لیا کہ قائد اعظم ہیں میرا بیٹا مراد چورہ ایک دم توجہ ہو گیا اور میں نے فوراً دھانی میں بڑے اشتیاق سے سلام کیا۔ انہوں نے ایک کشادہ جسم سے میرے سلام کا جواب دیا۔ بس میں کچھ کبیری زیارت ہو گئی۔ 1947ء میں جب پاکستان بنا تو ملاقات کی حسرت مٹانے کا پھر ایک موقع آیا۔ گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں وہ بطور گورنر جنرل قیام پزیر تھے۔ ہم سب حکومت نائے آئے اور ساتھ ایک ایک کارڈ بھی جس پر اپنا نام لکھنا تھا۔ تاکہ اس کا کارڈ کچھ گورنر کو تحارف کرانے میں سہولت ہو۔ میں بڑے شوق سے چلا۔ بعد ازاں بڑے خاں جواب ہمارے ایک بیٹے میں میرے ساتھ تھے۔ راستے میں ایک مقام پر سڑک کی حسرت ہو رہی تھی۔ موزاکا ایک پیسہ وہاں کر گیا۔ میری موزاکا پیسہ سال میں ایک دو بار ضرور کسی ایسی ہی جگہ کر جاتا ہے۔ اس چھوٹے سے حادثے کی وجہ سے ہم قریباً آدھ گھنٹہ دیر سے پہنچے۔ تحارف کی تحریف ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ گو یائیں وہاں بھی قائد اعظم سے ہاتھ ملانے سے محروم رہا۔ دور سے ہی دیکھتا رہا۔ گو بہت حقیقت اور فخر سے دیکھتا رہا۔ اس آرزو کی راکھ میں ایک دفعہ پھر گرمی پیدا ہوئی جب کئی سال بعد میں نے محترمہ فاطمہ جناح سے ہاتھ ملائے۔ وہ قید چودھری نذر احمد خاں مرحوم کے مکان پر ہوا۔ آدھا تو اب ان کی روح کو ملا۔ مرحوم سے کہیں یہ نہ کہیں گے کہ وہ خداوند اسرار گشاہ ہو گئے ہیں وہ باہل زلزلہ ہیں بلکہ اس وقت بھی موجود ہیں۔ مرحوم کا مفہم جو کچھ ہو میرا مطلب یہ ہے کہ اللہ ان پر رحم کرے کیونکہ وہ اب اناری جنرل ہو گئے ہیں۔ اللہ بخشے ان کو اپنی جگہ پہنچنے کا وقت آئے۔ بچارے اچھے آدمی

بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تین مشہور رحمانوں میں سے یہ کون سے رحمن ہیں۔ ایک رحمن جو بہت مشہور ہے آچار مرے کا کام کرتا ہے اور اس کی کھدائی امرتسر کی سڑک پر واقع ہے۔ دوسرا رحمن جو اس سے زیادہ مشہور ہے کلام ہے۔ گورنمنٹ کانٹا کے زمانے سے ہم اسے جانتے ہیں۔ لڑکے ابھی بستر میں سوئے ہوتے تھے کہ وہ قحطیت کے کہ چلا جاتا تھا اب بخشن پر ہے اور وہ مجھے کبھی کبھی دے کے کھٹے بتاتا رہتا ہے کیونکہ خود اس کا دوسری طرح ٹھیک نہیں ہوتا۔ تیسرے رحمن وہ ہیں جو اسے مشہور نہ ہو سکے اور جنہوں نے اپنا عہد میرے سپرد کرنے کے باوجود اپنی روحانی شاعری میں سے ایک شعر بھی میرے لیے ترکے میں نہیں چھوڑا۔ حالانکہ لوگ اس غلطی میں مجھے ادبی جلسوں کی صدارت کے لیے جلاتے ہیں کہ میں نے ان کا عہد سنبھالا ہے تو ان کے اثاثے پر بھی قبضہ کر لیا ہوگا۔

اللہ میں اور رحمن صاحب ایک مکان میں ضمیر ہوئے تھے۔ ایک روز ان کا ایک دوست آیا اور مدعوئے کے لیے فصل خانے میں گیا وہاں اس نے میری قحطیت والی پرانی پیالی بھیجی۔ باہر آ کر رحمن صاحب سے پوچھا کہ یہ پیالی کی کوری آپ نے کس لیے رکھی ہے؟ رحمن صاحب نے فوراً کہا یہ میری نہیں کیانی صاحب کی ہے۔ مجملہ اور فکاہوں کے رحمن صاحب سے مجھے یہ بھی شکایت رہی کہ وہ میری پروردہ کرتے ہیں۔ اب وہ اپنے دوست سے یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ کوری تو میری ہے مگر کیانی صاحب نے تمہارا ہی ہے اس لیے انہیں نہیں چاہتا کہ پیچیدہ دوں یا کیانی صاحب ہی کی سحران کی شادی میں بیوی نے قحطیت دی تھی اس لیے بیوی کے خیال سے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ جب میں ان سے اس قسم شکایت کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ میں تمہاری شہرت کے لیے یہ باتیں پہنچاتا ہوں اور میں ضمیر یا حداساد اچانک۔ ان کی باتوں میں آ جاتا ہوں۔ اور بھگتا ہوں کہ اگر اور کوئی چیز نہ کہہ سکا تو تانی کی کوری ہی تھی۔ غرض اس کوری کا قصہ ختم کرنے کے لیے میں شیخ عاتیت اللہ کی دکان پر گیا۔ کوری تو ان کے پاس نہیں ملی مگر جیسے ان کو معلوم ہو کہ میرا شیخ تک برش بھی پڑا ہے اور آئینہ بھی لٹا ہوا تھا۔ یہ چیزیں میرے سپرد کر دیں۔ ان صاحبان کو یہ سب باتیں خود بخود معلوم ہو جاتی ہیں۔ پھر کہا کہ ایک خاص چیز لیجئے۔ پھگڑی کی فصل۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ اگر قحطیت کرتے وقت چروہ رک جائے تو یہ فصل اور لگانے سے ڈم بند ہو جاتا ہے اور خون رک جاتا ہے۔ میں نے کہا اب خون کی کمی کی وجہ سے چروے نے کٹنا چھوڑ دیا ہے۔ اب مجھے پھگڑی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ خدا کا کرنا کیا ہوا یا پستلی ریز کرنا کہ کھینچے کہ اگلی بیج شہر کرتے ہوئے میرا چروہ رک گیا۔ میں نے سوچا میری زندگی بھی کیسے نفسیاتی واقعات میں ابھی ہوئی ہے۔ وہاں شیخ عاتیت اللہ نے چروہ کھٹے کا ذکر کیا۔ یہاں میرا چروہ رک گیا۔ دو آواہا ہوا کہ میری ناک کا ذکر نہیں کیا۔

اس تقریر کے کھٹنے کے بعد کل مجھے معلوم ہوا کہ چودھری نذر احمد خاں بھی ایبٹ آباد آئے ہوئے ہیں۔ مجھے ایک ایسا واقعہ یاد آ جاسے کہ کبھی میرے دل میں ایک کھڑکی کی کھل جاتی ہے اور پھر میں اسے زور سے بند کر دیتا ہوں۔ 1946ء کی سرگرمیوں

ہاں نہیں ہے۔ میں بھی کبھی ایسے گمان کر کے صریحاً غیر متضرع ہو جاتا ہوں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ ”کبھی کبھی“ کی قید میں اپنے اوپر غلط لگائی ہے۔ بہر حال مجھے شک تھا۔ ہوا اور ان سے پچھڑا کہ جب یہی کو اپنے خاندان کا عاشقانہ خط ملا تو اس نے کیا کیا۔ انہوں نے گول مول جواب دیا۔ ”ایسی صورت میں ایک عورت کیا کرتی۔ بس وہی کیا جو عورتیں کیا کرتی ہیں۔“ میں نے کہا ”یہی تو تمہاری ظلمی ہے۔ وہ بھل عورت تھی یہی وہی تھی۔ وہ بہت خوش ہوتی کہ کم از کم دور سے میرا خاندان مجھے حسین سمجھتا ہے اور اسی خوشی میں اس کو اجازت دے دیتی کہ دوسری عورت سے بھی شادی کر لے یا کم از کم محبت کا اظہار کرتا رہے۔“

اپنے دوست سے میں نے کہا مجھے اب پتہ چلا ہے کہ تم جھوٹ بھی بولتے ہو اور پتہ چھین جان لو کہ یہ جرم کسی اخبار یا رسالے کی تنقید پر نہ کر دے دیتے ہو یہ ایک قسم کا اوپن سرقہ ہے جو دوسری قسم کے سرکوں سے زیادہ ترش ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ اے نیم پختہ خرپڑے میں نے کب جھوٹ بولا تھا۔ قے نے تو نہیں پوچھا تھا کہ میں نے کتاب پر بھی ہے یا نہیں۔ اور اسی کتاب میں پڑنا کیا مجھے ہالے کسے نہ لگتا ہے۔ اس دن سے میں بھی ایک ادھر شعر یاد کر لیتا ہوں۔ مگر جس آسانی سے شعر یاد کرتا ہوں اس سے زیادہ آسانی سے بھول جاتا ہوں۔ مثلاً اس وقت مجھے یہ مصرع یاد ہے۔ ”بھول جانا نہ میں یاد دہاری رکھتا“

مگر آئندہ سال تک میں اسے ضرور بھول جاؤں گا۔ جب کوئی مجھ سے کسی ایسے شعر یا مصرع کا ذکر کرتا ہے تو میں کہہ دیتا ہوں کہ اس شعر کے بعد میں نے اتنا کچھ پڑھا ہے کہ کچھ سال کا سا رطلم اس کے نیچے ب گیا ہے اور انکڑا ہوا ہوتا ہے کہ بہت پڑھنے والوں کا علم بے عمل کی ہوانہ گدب کر کھاتا ہوتا ہے۔

میں جب بھی اردو فارسی کے چند اشعار کو اپنی مجالس کی صدارت کا تمنا کرتا ہوں تو مجھے ”چمن تصویر تہاں چندہ سنوں کے خطوط“ یاد آتے ہیں جو مرنے کے بعد کسی شاعر کے گھر سے نکلے تھے۔ تصویر تہاں کو تو میں نے اپنی زندگی ہی میں تک کر دیا ہے اور اس اشعار کا نام میری میری ہوا دار بنی ہی پیش پیر پڑھے مجھے وہی دیتی رہی ہے۔ آپ کا بھی کبھی تجربہ ہو گا۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ میں اپنے حلقہ جہاں میں شہر کے شہرت حاصل کرتا پاتا ہوں۔ اس پر مجھے اس دوست کی بات یاد آتی جو زندگی میں میرا دوست بھی ہے اور فلاسفر بھی۔ اس نے فیروز پور سے خط لکھا کہ لکھنا نہ (جہاں ہم پہلے رہے تھے) چند خواجہ تین آئی ہیں۔ انہیں ”بنگم کے (K)“ سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی کبھی بچ بچ بولا کرتے ہو۔ میں نے کہا یہ کبھی کی قید کیوں لگاتے ہو تو حضرت مہداتق اور جیلانی کی طرح ہمیشہ بولتے ہوں۔ صرف اچھا غیر حاصل کرنے کے لیے اس میں پانی کی طرح تھوڑی سی جھوٹ کی آمیزش کر دیتا ہوں۔ جس سے ایک عذر اخراج پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ عذر کا لفظ میں نے کیوں استعمال کیا ہے

ویسے کسی اور طرح سے شہید ہونا بہتر ٹیکہ شہادت پر کچھ فرق نہ آئے برداشت کر سکتا ہوں۔ مگر مجھے اس شخص کا قصہ یاد آ جاس کو یا ر دوستوں نے کسی خاص مطلب سے مشغور دیا تھا کہ تم نواب صاحب بن جاؤ۔ اس نے کہا کہ مجھے تو توانی کے ڈھنگ نہیں آتے میں کیسے نواب بنوں۔ یاد دوستوں نے کہا اس میں کیا مشکل ہے۔ تم سرخ قنادیری کی اینگن اور طلائی جوتا پہناؤ ایک گاؤں تک پہنچے رکھو اور ایک چھان آگے اور ہم جو کچھ تم سے پوچھیں اس کا صرف ایک ہی جواب دو ”کیا مضائقہ ہے۔“ مگر یہ خیال رہے کہ قاف کی آواز گلے کے اندر نہ آتی اندرون سے نکلے۔ پس نواب صاحب مذکورہ بالا آداب میں سے کچھ بہن کر اور کچھ پاس رکھ کر چلے گئے۔ یاد دوست اور گر چھوٹے۔ ایک نے کہا ”نواب صاحب پان پٹن کیا جائے۔“ جواب دیا ”کیا مضائقہ ہے۔“ پان پٹن کیا گیا۔ دوسرے نے کہا ”نواب صاحب رقص ہو“ فرمایا ”کیا مضائقہ ہے۔“ رقص آئی اور اس نے اپنے رقص سے نواب صاحب کو کھنکھوڑا کیا۔ اقصاء جب کئی مراحل بلا مضائقہ سے ہوئے تو ایک طرف نے پچھا ”نواب صاحب آپ کی پانپٹن سے خاطر کی جائے؟“ جواب ملا ”کیا مضائقہ ہے۔“ نواب صاحب یہ کیجئے کہ پانپٹن کوئی رانگی ہوگی۔ کیونکہ فارسی میں مذکور صفت کا فرنی نہیں ہوتا۔ یہ واحد مذکر جمع ذکر کی گردان اردو بولنے والے ہی کرتے ہیں اور جمع کا صیغہ کٹر صحت ہوتا ہے بلکہ صحت ہوتی ہے۔ اور اس کا نام اپنا رکھتے ہیں جو آپ سے اسم تصغیر ہے۔ اچھا تو بات ہو رہی تھی مصطفیٰ نواب صاحب کے پانپٹن دکھا چورے کی اور وہ بھی مثال کے طور پر۔ میرا مطلب محض یہی تھا۔ ”مگر خدا یا پاری کدہ سال سی شوم“ خدا کی پاری ہو یا نہ ہو آپ کی است سے اگلے سال میں اوپ ب حاصل ہونے کا اعلان کر دوں گا۔ اور اس کے لیے چند اردو فارسی کے شعر اور چند ادبی محفلوں کی صدارت کو کافی سرمایہ تصور کیا جاتا ہے۔ مگر صدارت کے لیے تو جنس کا ادھار ہی عین ہے ہیں یا صدارت ان کو کتنے ہے۔ ابھی تجویز دیر میں وہ آپ کو بتائیں گے” میں سمجھتا ہوں کہ کیا نواب صاحب نے ایک سے طرز بیان کی داغ بیل ڈالی ہے۔“ داغ بیل کیا تارکول کے منکے ڈالے ہیں۔ آپ پہلے ہونے ہو یا پھر ہیں کہیں محفل نہ جائیں۔ سوچ کچھ کر چلیں مگر بدگمانی نہ کریں ”ہر کھٹ ایک اردو کا فرد“ اگر جنس سہاویہ باتیں کیجئے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں تو میری صلاح ہے کہ ضرور کہہ دیں۔ میرے ایک دوست جو مذکورہ بالا سرمائے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ اپنی مال و متاع رکھتے ہیں۔ مجھے ہمیشہ پریشان کیا کرتے تھے۔ ان کی پڑھی ہوئی کتابوں سے میں ناواقف ہوتا تھا مگر معلوم ہوتا تھا کہ میری پڑھی ہوئی ہر کتاب کا وہ مطالعہ کر چکے ہیں جب میں کسی نئی کتاب کا نام لیتا تو وہ کہتے ”ہاں اس میں غلاں کردار کو بغیر کھنکھن کے دھن کر دیا گیا تھا کہ کھنکھن زدنی کا اعتراف نہ ہے یا یہ کہ غلاں کردار نے اپنی بیوی کو اس غلطی میں مبتلا کر دیا تھا کہ لکھا تھا کہ وہ کوئی دوسری عورت ہے۔“ میں حیران و پریشان تھا کہ یا اللہ یہ کہاں سے آئی کتابیں پڑھ لیتا ہے۔ اگرچہ برا گمان کرنا

دو نذر ایک سے نہیں بنتے اور اگر بنتے تو جبری بات ہی بنتے ہیں۔ اب ہم ایک دوسرے کا انتقاد کر رہے ہیں کہ دونوں میں سے پہلے کون اللہ کو پکارا ہوتا ہے تاکہ دوسرے موقع ملے کہ اس کے خطا چھپا دے اور ساتھ سمجھا لکھ دے کہ جو عینک لوگ ہیں وہ ہمیشہ داغ مفارقت دے جاتے ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ کرم دونوں میں سے کون زیادہ عینک ثابت ہوتا ہے۔

میں نے تقریر کے شروع میں کہا تھا کہ یہ سالانہ جلسہ میرے لیے ایک امتحان بنا جا رہا ہے۔ اس واقعہ کو میرے ساتھ وہی ہوا ہے جو ایک ست طالب علم کے ساتھ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہوا کرتا تھا۔ مجھے وقت پر بلکہ وقت سے پہلے ہی خوشامد تھا کہ یہ جلسہ کچھ سال کی طرح ہوگا۔ اگر کوئی بدچلتی اس میں ہو سکتی ہے تو صرف اتنی کہ فرماں روا یا ان انگلستان کے چشم ان کی طرح اس کی تاریخ آگے پیچھے کر دی جائے۔ میں نے سیکرٹری صاحب کو زور دیا کہ قبل ازاں قیود ہوا سال بدستور افضل مہرازی چلے آتے ہیں لکھا کہ اداں تو میں موز میں نہیں دوسرے ابھی کیا جلدی ہے۔ طالب علم بھی یہی کہتا ہے کہ ایک مہینہ تو چھٹی منائیں پھر چھٹیوں کا کام شروع کریں گے۔ مہینہ تو رنے کے بعد بھی شیطان یہی کہتا ہے کہ ابھی کیا جلدی ہے۔ پھر جب اس چھوڑ دیا کہ وہ جاتے ہیں تو سانس پھولنے لگتا ہے اور شیطان تو کھین نظر نہیں آتا کہ اس کو غریب جرم میں تازیانے لگائے جائیں مگر افضل مہرازی نظر آنے لگتے ہیں وارث کا جنازہ حرکت نہیں ہے۔ اس قسم کے قانونی فقرے ہم اکثر بغیر سمجھے ہوتے سنا کرتے ہیں اور کبھی کبھی ان کو کھلا یا بھیج استعمال کرنے کو دل بھی جاتا ہے۔ بہر حال جب موت کی طرح پہلے کا مہینہ وقت آن پہنچتا ہے تو نہ موز کا بھانا نہ کر رہتا ہے نہ فضا رخن کا۔ یہ موز کا لفظ آپ کی طبعی رسائے محسوس کر لیا ہوگا کہ انگریزی ہے۔ بعض لوگ کتنی جلدی سمجھ جاتے ہیں۔ ایک انگریز خاتون اپنے خاوند کے متعلق کہا کرتی تھیں کہ وہ اسے دانشور ہیں کہ کسی وحدہ وستانی کا نام نہ کر ہی بتا دیتے ہیں کہ وہ مرد ہے یا عورت۔ مثلاً عدیل مرد کو کہتے ہیں اور عدیلہ عورت کو۔ اگر انہوں نے وہ کا نام نہ ہوتا تو کبھی کبھی گریو پر سننے میں آتے تو انہیں مرد اور عورت کی تیز میں اور کبھی آسانی ہو جاتی۔ ”عبدالرحمن کی میں عداوت رہا۔“ یہ موز کا لفظ کو انگریزی ہے مگر میں اس وقت سے اسے استعمال کرنے لگا ہوں جب سے بعض لوگوں کو پھر لافاق ہوئی ہے کہ مسز کی بجائے کون سا لفظ استعمال کیا جائے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ سب کو خاں کہو۔

میرے ایک دوست جب مؤذ میں ہوتے ہیں تو مجھے طغیانی صاحب کہتے ہیں اور جب مؤذ میں نہیں ہوتے تو خاں کہتے ہیں۔ جب مؤذ زیادہ خراب ہو تو دسرخوان بھی کہہ دیتے ہیں۔ ابھی یوں مؤذ سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ کیفیت یا اس کے ہم معنی الفاظ میں کہاں۔ ہاں اگر چرت کا قطعہ سنا جائے تو مؤذ سے بھی بڑھ کر ہے۔ میں نے جب پہلی دفعہ سنا تھا تو کہنے والے نے کہا "قاف" پر درشاں لعنت چرت مرا خراب کرد" کس موقع پر کہا گیا تھا اور میرے اجداد مؤذ کا قافیہ موش کا کیا؟ یہ رجن صاحب بتائیں گے۔ اس کا

ایک الگ داستان ہے جو پھر کبھی آپ کو سناؤں گا۔

پچھلے سال میں نے ستر سچس کا قصہ سنایا تھا جس نے اپنے فائدہ کو گھر کی خادمہ سے پیار کرتے دیکھا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کسی ایسے شخص نے جس کو میری مہائی جٹگری پر ملک رہتا ہے کسی دوسرے ایسے شخص سے جو چھاکہ یہ ستر سچس کون ہے؟ اس نے جواب دیا ”کوئی ہو ہی“۔ پچھلے شخص نے بات کی گہرائی کو سمجھ کر بڑے رازدارانہ طریقے سے سر ہلاتے ہوئے کہا ”ضرور کوئی ہو ہی“ اب اگر یہ صاحبان اس ہوی خاتم کا سراغ لگائے گا تو ستر سچس تو میں کہیں کا نہ رہا کیونکہ یہ ان چنگی باتوں میں سے نہیں جن کا ذکر میں حضرت عبداللہ و بیانی کی ہی راست گوئی سے کرتا ہوں۔ ان کا یہ قصہ تیسری جماعت میں پڑھا تھا کہ ایک سفر میں جاتے وقت ان کی ماں نے دینار ان کے جوتوں کے تھکوں میں ہی دیے تھے راستے میں ڈاکوؤں نے ان گھبراہٹ میں مال و متاع جھین کر انہوں نے جو چھاکہ اور بھی کچھ ہے؟ جواب دیا ”ہاں جو تے میں اسنے دینار دیے“۔ وہ سن کر دیکھو میں بڑا رہا ہے۔ ان دنوں بنائے لفظ عام بہم نہیں تھا اس لیے جی بھلا انہیں سمجھ کر کہیں کہا کہ میں کل جی رہا ہوں۔ ڈاکو چلے گئے اور پوچھی جاتے سمیت سلامت رہ گئی۔ اسی اصول پر میں بھی کم از کم اپنے گھر میں ضرور کچ بولا کرتا ہوں جس پر ایک بھتیجی نے انہیں آواز دے کر اٹھائے اس کا رنج ہوتا ہے کہ میری بات کو مذاق پر غمول کیا جاتا ہے۔ دو تین سال بعد جب ان کو کسی اور در سے کچھ معلوم ہو جاتا تو کہیں ”آپ تو چھپے رستم لکھے“۔ میں کہتا ”آپ سے کیا چھپا ہے۔ آپ کے سر کی قسم میں آپ کو ہمیشہ بتاتی رہا ہوں تا کہ مجھ سے پہلے کوئی عورت آپ کو نہ بتادے کیونکہ عورتیں چل خور ہوتی ہیں اور میں غوری اپنی داخلی ان سے بھر کر سکتا ہوں۔“ وہ کہیں ”مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ کچ بول رہے تھے۔ میں بھی آپ مجھ سے بات دیکھنے بات دو تین سال پرانی ہوئی کہ آپ کو ج سے زائد ایسا ہو گئی ہے۔ مگر نہ بعد اوردانے ڈاکوؤں کو بتانے کی کوشش کی تھی نہ میں نے آپ کو۔“ پچھلے آپ کا سن غن سے کہ آپ مجھے راست گو نہیں سمجھتیں۔“

توہاں میں "چتر تصویر" جہاں چند حسینیوں کے خطوط کا ذکر کر رہا تھا۔ تصویر جہاں توہاں تلف ہو گئیں باقی رہے حسینیوں کے خطوط۔ وہ مجھ سے ڈاکٹر سید عبداللہ نے لے لئے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اور غیل کاٹیج کے پرنسپل ہیں۔ اس دفعہ مجھے ایبٹ آباد میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ادب میں جہلا دلوں کا سوال ایبٹ آباد میں ہوتا ہے۔ انہیں نے خط لکھا میں نے بھی لکھا مجھے کا معلوم تھا کہ حسینیوں کے خطوط وہ اس طرح جمع کر رہے ہیں۔ ان کی دین و دھرم ان کا دوسرا حسن بھی کمال نظر آیا۔ پھر مجھ سے طے ہوئی کہ دیکھا کہ ایک دین و دھرم کا نوں میں بھی لکائی ہے یہ ہے اس آئے کا نام و روش ہو جاتا ہے۔ یعنی دور سے سننے والا آلہ۔ اس لئے کہ

نے پوچھا تھا کہ کیا آپ کی پشیمانیاں مزے کی ہیں؟ انہوں نے گول مول جواب دیا۔ کہنے لگے تمہیں ہے ہوں مگر آپ کی زیادہ مزے کی ہوں گی۔ ”میں نے کہا کہ ابھی تک تو میں خوشام نہیں ہوا۔ یہ جواب میں نے اس لیے دیا کہ اس وقت مجھے تقسیم ہند سے پہلے کے ایک چیف منسٹر کا خیال آ گیا تھا جس نے اپنی وزارت سے بٹنے کا آٹھ دن بعد یہ کہا کہ میں نے اپنے وقت میں سیاست کے میدان میں بہت سے بڑے کام کیے ہیں۔ مگر کسی ایک پر بھی کبھی پشیمان نہیں ہوا! اللہ عز و جل ایک بات کی پشیمانی ہے وہ یہ کہ میں نے دینی دلائل کو اعتبارات جیسے کی بھی کو خوش کن تھی۔ میں نے کہا کہ یہ احساس اگر اس وقت ہوتا جب آپ برسرِ اقتدار تھے تو توجہ سے تم ہی سمجھتے.....“ اور مجھے تو یہ پشیمانی بھی نہیں۔

بچے دارگوں کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں مگر سنا ہے کہ آٹھ دن اور جنس کیا کس بتاتے ہیں کہ ان میں سے ایک، بالکل افسوس بھی ہے۔ میری موسیقی کی کتاب میں نو بچے دارگ ہیں اور بالکل افسوس سے اگلے دارگ کا نام صرف دینی نہیں بلکہ دینی عدالت ہے۔ آپ نے بھی سوچا کہ اس کو دینی عدالت کیوں کہتے ہیں؟ صرف اسے لیے نہیں کہ مقدمے والوں کو دینا اور دینی ہے بلکہ مقدمہ سننے والوں کو بھی دینا بنا دیتی ہے۔ میرے بھائی کیا کس (جواب پر پریم کوٹ کو پیارے ہو گئے ہیں) سننے دوسری طرف منہ پھیر لیتے ہیں اور میں سننے سننے سوچتا ہوں۔ خدا کرے اب میں جاگ اٹھوں۔ ویسے عدالت دینی میں دینا کوئی نہیں ہوا بلکہ اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ کسی بادشاہ نے اہل عدالت کو کام کرتے دیکھا تو کہا ”لہذا دینا اس اند“ یعنی دینا کی طرح کام کرتے ہیں اور آج کل خود کو خود پر جتا پڑتا ہے۔ آپ نے داستان امیر خسرو میں دینا کے سیاہ کے سینگ دیکھے ہوں گے۔ تو تو سینگ کی بجائے وہی سینگ لگا ہوا ہوں۔

اس خوشامی کے عنوان کے علاوہ پانچ اور عنوان ہیں۔ سب سے پہلے تو وہی پچھلے سال والا مضمون ہے ”افکار پریشان“ مگر اس دفعہ پر ریکارڈ میں قسط ثانی لکھا ہے۔ یہ ایک نئی قسم ہے افکار کی۔ اس کے بعد ہے ”میں نے کیا دیکھا؟“ اور ”ریکون میں لکھا ہے“ ”دیکھنا بھی کدہ دیکھا کرے کوئی“

یہ تو کچھ مہورام جیسے مضمون ہے۔ میں نے کیا دیکھا؟ وہی جہر آپ نے دیکھا نہ زیادہ سے زیادہ مہورام کو دیکھا۔ بس فرق یہ ہے کہ کوئی رام کو دیکھتا ہے کوئی رب کو اور فرق محض زبان کا ہے۔ جیسے ایک شخص یا کریم کی بجائے یا کریم کو دیکھتا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مرشد کی حضرت موسیٰ مرشد کرنے والے پیغمبر تھے۔ مرشد ہی پر کیا موقوف ہے کبھی ہمدت کے خیال سے یا ہمدت سے مکالمہ بھی مار دیتے تھے۔ ایک بھارے دھقان نے فرط محبت میں اپنے خدا کو طالب کر کے دو دو کی پانی پیش کی۔ موسیٰ علیہ السلام

مافوق اب بھی غضب کا ہے۔ میرے دماغ میں تو فضا رخون کے گرنے سے صرف موسیٰ موسیٰ لکیریں رہ گئی ہیں۔ مگر یہ شیطان میرے کانوں میں بھڑکیوں کو گونجنے لگتے ہیں۔ شیطان کا نام لینے سے میں اب گھبرا پڑتا ہوں۔ کسی زمانے میں شیطان سے اچھا میل ملاپ تھا وہ اب رقیبوں سے ملتا ہے۔ گھبرا پڑا اس لیے ہوں کہ ایک دفعہ میں شیطان کا ذکر حضرت آدم کے برہشت سے انوار کرنے کے سلسلے میں کیا تھا تو کئی لوگ یہ سمجھ کر شیطان کے پردے میں نے ان کا ذکر کیا ہے حالانکہ ان میں انوار کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ ”انا کشر من الرجال“ یا کشر ہوتا ہے کہ ہمدل کے آئینے میں مجھ جیسے ہیں اور میں شیطان نظر آتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہم ہی ہیں پر نفس نکس۔ یا اپنا فعل نظر آتی ہے تو پشیمان لینے کی یہ شیطان ہی ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ نے خواب میں شیطان کو دیکھا۔ آدم کے وقت سے اس پر مسرتو تھا ہی۔ دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے۔ شیطان کو ڈانسی سے بکا کر مہ پر زور سے چھڑ لگا یا چھڑا جو نہ پر لگا تو جاگ اٹھے دیکھا تو اپنی ڈانسی میں تھم جاتی۔

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آٹھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

یہ شیطان کا ذکر غالباً میں اس غیر شعوری اثر کے تحت کر رہا ہوں جو جنس مہادیٰ فہرست مضامین کے چپے کے طور پر پیدا ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ افغان میں زبان کے پرے میں مومراں اس طرح کے سوال ہوتے ہیں۔ ذیل کے کوئی کچھ افکار نظروں میں استعمال کرو یا مندرجہ ذیل مضامین میں سے کسی ایک پر مضمون لکھو۔ ایک دفعہ ایک لڑکا انگریزی پرچہ کے نکلے لکھا اس نے دوسرے لڑکے سے پوچھا کہ تم نے کسی چیز پر مضمون لکھا ہے۔ اس نے کہا کہ ”دھبرے کے تہوار“ پر لکھا ہے۔ پہلے لڑکے نے کہا کہ میں نے ”مہورام“ پر لکھا ہے۔ پوچھا کیا لکھا ہے۔ جواب دیا کہ میں اس کو جانتا نہیں تھا مگر کچھ کوئی ہندو ہوگا۔ اور یہ تصور کر کے کہ متحین بھی ہندو ہوگا احتیاطاً میں نے لکھا کہ مہورام بہت سعادت مند لڑکا ہے۔ ہندو ہوتے ہوئے بھی اشران نہیں کرتا۔ اللہ عز و جل کے موسم میں اٹھی ہے پانی اڑا اڑا کر پھیلتا ہے اور ساتھ کہتا جاتا ہے مہورام! مہورام! دوسرے لڑکے نے فس کر کہا ”ارے مہورام! دو تو حرم پر مضمون لکھتا تھا۔ تم نے اسے مہورام کیسے پڑھا۔“ آٹھ جنس مہورام نے بھی ایک فہرست دی ہے جس میں پانچویں نمبر پر مضمون ہے۔ ”خبریات زندگی“ کچھ اپنے کچھ پرانے اور قریب سن مبنی پر ریکارڈ میں لکھا ہے کہ بڑے ہی مزے کی پشیمانی ہیں۔“ اس لیے میں نے زیادہ تر اپنے ہی تجربے بیان کیے ہیں اور جہاں کہیں شیطان کا ذکر ہے اسے پرانی فہرست میں شامل کیجیے۔ مگر جب میں کہتا ہوں کہ کسی زمانے میں شیطان سے اچھا میل ملاپ تھا تو پشیمانی کے جذبے سے نہیں کہتا۔ جنس مہورام صاحب سے میں

تو میں کہہ رہا تھا کہ قوس کمان کو کہتے ہیں اور قوس میں یعنی دو کمان۔ قاب قوسین سے مراد بلند رو کمان۔ اور یہ جملہ چونکہ خدا اور اس کے رسول کے قریب کا درجہ بیان کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس لیے درتا ہوں کہ کوئی ناراض نہ ہو جائے کہ قرآن شریف کے لفظ کیوں استعمال کرتے ہو۔ آپ کو کیا بتاؤں کہ اس سال میرے پاس میری تحریروں سے متعلق کیسے خط آئے ہیں۔ وہ تعریف والے خط تو ڈاکٹر سید عبداللہ چیموائی کے بشرطہ میں ان سے پہلے اللہ کو یاد کیا ہو گیا۔ ان دوسرے خطوط کا ذکر میں بھی کبھی خود کر لیتا ہوں تاکہ سدرہ کے ساری دنیا میں ایبٹ آبادی طرح سبزہ میں اور ایبٹ آباد میں بھی برف بارش ہو کر پتی ہے۔ ایک دفعہ میں نے ضنا کہا تھا کہ آپ بھی اسلامی جمہوریہ، بھی اسلامی قافلے، بھی اسلامی روزوں کا ذکر کرتے ہیں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ اپنے اندر وہ استقبال پیدا کریں جو اس وقت کے عرب میں تھا۔ مگر خدا ارادے اسلامی استقبال نہ کریں۔ اس پر کسی نے ناراض ہو کر کہا کہ اول تو ایک بیچ کو ان باتوں سے کیا سارکار۔ دوسرے یہ کیا کر آپ میں اسلامی جوش نہ ہو (چاہے ایک اور اسلامی حاورہ ہے) تو نہ کسی خدا کے فضل سے انھوں ایسے موجود ہیں جو اسلام کے نام پر خون بہانے کو تیار ہیں۔

اب ہم خطرناک زمین پر پہنچ رہے ہیں "اوس زمین را نام باشد کہ بلا۔" "خون بہا کی تو قرآن میں بھی تعریف ہے مگر خون بہانے کے اور بہانے کچھ کم ہیں۔ مجھے ایک اور چیف مشرک قصہ یاد آ رہا ہے جو اپنے دوستوں سے کہتا تھا کوئی کار خدمت بتاؤ۔ ایک نے کہا کہ مسٹر سوئے نے مجھے گلہ کر رکھا ہے۔ اس کا اگر کچھ کر سکیں تو۔ چیف مشر نے بات کانٹے ہوئے مجھے کہا اس شخص کا قصہ یاد آ رہا ہے جس نے میری طرح کسی دوست سے کہا کوئی کار خدمت بتاؤ۔ دوست نے کہا اٹھان قصائی کی مجھ سے دشمنی ہے چلو اسے ماریں۔" اس شخص نے کہا "انہیں بھائی قصائیوں کے پاس چھرے ہوتے ہیں اور ان سے مجھے مت لڑاؤ۔" میں میرے بھائی (چیف مشر نے اپنے دوست سے کہا) مجھے انگریزوں سے نہ لڑاؤ۔ ان کے پاس بھی چھرے ہیں اور میں چھری چاقو سے ڈرتا ہوں مگر ڈرتے ڈرتے ایک چھوٹی سی بات اپنے بڑے منہ سے کہا کہ انہوں وہ یہ کہ جب یہ خون ریزی تو بہت قابل قدر ہے۔ اس کے اعتبار کے مواقع آئے بھی ہیں اور خدا نے چاہا تو آئیں گے بھی۔ مگر اس سے پہلے آپ اسے اپنے دل میں استقبال کی گری پیدا کر لیں اور یہ بعد اوی طرح ڈاکوؤں کے سامنے اور میری طرح گھر کے اندر بھی بیچ بولنے میں تامل نہ کریں اور غیانت کو کسی فعل میں دیکھ کر خون نہ کسی آنسو ہی بہا میں تو آپ قوی حیثیت سے وہ کچھ بن جائیں گے کہ خون بہانے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

کل میں جھٹلے کیا۔ درختوں کے ایک چمٹے سے جھٹکی کہتے ہیں ایک تو جان لگا اور اس نے تپاک سے سلام کیا۔ ری کوئل دے رہا تھا۔ میں خوش ہوا کہ یہاں بھی لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔ مگر وہ مجھے کسی قسم کا انجیلر سمجھا تھا۔ میں اور بھی خوش ہوا کہ کبھی کبھی

نے کہا یہ تو کھر ہے اپنے منہ میں روٹی خنوس۔ "پنہ اندر بان خود فشار۔" ان دنوں خون کا فشار نہیں ہوتا تھا پنہ سے فشار کر لیتے تھے اور پنہ چونکہ صرف منہ میں نہیں خنوسا جاتا بلکہ زخموں پر بھی لگا یا جاتا ہے اس لیے ہم اپنی فرست کے اگلے مضمون پر پہنچ رہے ہیں جس کا عنوان "ہمارا اسلامی ماحول" اور بریکٹوں میں لکھا ہے "پنہ کا کچا خیم" یعنی کسی کس خیم کا لو کہنے سے روکوں۔ زخموں کا جائزہ تو پھر لوں گا پہلے یہ بتا دیتا ہوں کہ اس سال جنس سوار کے پرے میں بریکٹ بہت بڑھ گئے ہیں۔ ایک سال کانگور میں رو کر انہوں نے شاہ پھوس کر لیا ہے کہ ساری جو پٹری بریکٹوں میں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم اس لیے بریکٹوں کے باہری آلاخوں سے پاک رہیں۔ آپ کہتے ہیں (جب میں آپ سے کہوں سو آپ اپنے کو بریکٹوں میں ڈال دیا کریں۔) جس کا مدعا یہ ہوگا کہ حاضرین کے مواباتی سب یعنی پاسکھاے حاضرین۔

PRESET COMPANY EXCEPTED آپ کہتے ہیں کہ ہم اس لیے بریکٹوں میں ہیں کہ ہم کو بریکٹوں میں کر دیا گیا ہے اور ان بریکٹوں سے ڈر کر میں نے ایک جگہ قوسین کا لفظ استعمال کیا پھر قاب قوسین سے ڈرا۔ آپ میں سے جن خواہ میں نے نہ صرف کامیاب کیا ہے نہ قرآن شریف کا۔ ان کے فائدے کے لیے بتانا چاہتا ہوں کہ قوس کمان کہتے ہیں۔ آپ نے قوس قزح تو سنا ہوگا یہ قوس سے بھی آگے بڑھ گیا۔ کسی نے پچھا تو سہی کمان یہ قزح کس بزرگ کا نام ہے۔ مجھے خود معلوم نہ تھا۔ فیروز اللغات میں دیکھا۔ بڑی اچھی کتاب ہے۔ اگر چھاپے میں ذرا سیاسی ڈالتے۔ تو بڑے سن میں اور بھی اچھی ہوتی۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ آن کل روزیہ اپنی اور ہے۔ بہر حال فیروز اللغات میں لکھا ہے قزح (بریکٹ میں یعنی عربی لٹل لکھا ہے) یہاں بھی بریکٹ۔ آگے لکھا ہے "موٹ" "آسان پر بھی موٹ کی قید سے چھٹکا رہا نہیں۔ پہلے موٹ کو ہم گھروں میں قید رکھتے تھے۔ اب ہم ان کی قید میں ہیں مٹی طور پر۔ قید اسیر زلف والی قید سے زیادہ شدید ہے۔ مگر آئے چل کر کھوس آیا کہ قزح کیوں موٹ ہے لکھا ہے۔ قزح ایک فرشتہ ہے جو ابر کا موٹ ہے۔" یہ ابر کا موٹ تو ذکر کے سینے ہیں۔ فرشتہ موٹ کے ہوا۔ اگر ابر کے موٹ کی بجائے ہوا کی دبی ہوئی تو بات سمجھ سکتے آتی اور پھر فرشتہ کہ اس کو موٹ بتا کر کہیں تو اس کو ابر ہے۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ کفار فرشتوں کو اٹھ میاں کی بیڑیاں بکھتے تھے اور اللہ میاں نے کہا کہ اپنے لئے تو اسے تجویز کرتے ہو اور میرے لیے لڑکیاں۔ یہ کیا مذاق ہے؟ آگے لکھا ہے۔ قزح قبول صاحب رہاں شیطان کو کہتے ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے قوس قزح کو شیطان کی کمان کہتے ہیں۔ لیکن باتیں بڑھ کر مجھے ایک گونہ قسلی ہوئی ہے کہ اگر شیطان سے میرا میل ملاپ رہا تو فرشتے سے بھی زیادہ دور نہیں رہا ہوں گا۔ انسان اتنا فطرتاً انسان کا مرکب نہیں چنانچہ فرشتے اور شیطان کا ہے۔ کسی کا فرشتہ غالب ہوتا ہے اور کسی کا شیطان۔

لیکن موٹ کے آرائشی اوصاف سے بے بہرہ رہتی ہے۔

اس جوان سے جس نے چینی کے راشن کی شایستگی تھی میں نے کہا اس چنگی میں تو بہت درخت ہیں۔ اس نے کہا ہاں یہ تو بال بال ٹٹ گئے ہیں۔ یہ وقت تو چاند ماری کے لیے مخصوص ہو گیا تھا مگر ایک آگرہ ڈالنے پر یہ درخت دیکھے تو کہا کہ میں ان کو خراب نہیں ہونے دوں گا۔ چاند ماری کے لیے کوئی اور جگہ ڈھونڈو۔ میں نے بچھا کر ایک آب فیر درختوں کی قدر نہیں کرتے اس نے ری کوئل دیتے ہوئے کہا "اب تو بھگنوں میں پاکستانی افسروں کی بی بیوں کا نکات کاٹ کر اچھرن کا کام لیتی ہیں۔" "ری کوئل نے ایسے زور سے مل دیا جیسے پاکستانی افسروں کے گل ٹال رہا ہو۔

لیکن یہ خون بہانے کا جہز اگر ہر اس بات پر پیدا ہوتا ہے جو خودی کی نشوونما کے لیے مسخر ہے تو اس جذبہ کو میں نے بہت مشکل سے پیدا ہوتے اور بہت آسانی سے مفقود ہوتے دیکھا ہے۔ مجھے بھر ایک چٹان کا قصہ یاد رہا ہے۔ کیا کہیں اب کچھ چلے گئے ہیں تو چٹان ہی رہ گئے ہیں مگر اس دفعہ ایک بھٹی کا سیٹھ بھی قصے میں شامل ہے۔ یہ سیٹھ یہاں تاج محل کو قرضہ دیا کرتا تھا اور سال میں دو دفعہ اصل زر پاس دینے کے لیے لکھا تھا۔ اس محل کو اگر ان کی کہتے ہیں جین روپے بیع کرنا۔ اگر ان کے لیے ضروری ہے کہ ایک پاؤی گاڑ بھی ساتھ ہو۔ چانچا ایک چٹان کو ساتھ لے کر سیٹھ کو گرائی کے لیے لکھا۔ وہابی میں دھوپ کی شدت تھی۔ دونوں ایک سایہ دار درخت کے نیچے دو کھڑی آرام کرنے کے لیے چلے گئے۔ چٹان چارواڑ کا ایک طرف سو گیا۔ اسٹے میں ڈاکو آئے اور سیٹھ کو لوٹ لیا۔ سیٹھ نے بہتر راہروں کا چانچا چٹان نہ جاگا۔ چانچا بھی تو چاروے سے سر نکال کر اور آکھیں مل کر بھروسہ ڈالا۔ ڈاکو خود آرا دی تھے۔ ان سے یہ جنگ برداشت نہ ہو سکی کہ سیٹھ کا محافظ اس طرح سوتا رہے جیسے ان کا دم و جود برابر ہو۔ اس لیے انہوں نے جا کر چٹان کی چارو بھٹی میں اس پر بھی دو سوتا رہا۔ بھراس کی ناگ تکبھی۔ اس پر بھی دو سوتا رہا۔ بھراس کی آکھیں زور سے کھولیں اس پر بھی دو سوتا رہا۔ اب ڈاکوؤں کی خودی کا چانچا نہ لیر ہو چکا تھا۔ چٹان کی نوسار کا ڈپ پاس پڑا تھا۔ پٹاوری نوسار جسے سادے لکھتے ہیں "جب نوسار خوش رنگ است و اعلیٰ" ڈاکوؤں نے چٹان کے جسم کے دوسرے نصف حصے سے کچڑا اٹھا اور وہی نوسار چھڑک دی۔ تب چٹان جاگا۔ تب چٹان کو قصہ آیا۔ تب چٹان نے اپنا ڈنڈا لیا اور مست ہانچی کی طرح گرج کر ایسا حملہ آور ہوا کہ ڈاکو لوٹ کے روپے چھوڑ کر بھاگ گئے اور چٹان نے کہا۔ چلو سیٹھ اٹھا ڈاکو گرائی۔ اور سیٹھ چٹان اور وہی سے تینوں خیریت سے گھر پہنچ گئے۔ الگ الگ سیٹھ نے چٹان کی تحقیر کا حساب کر کے اس کو فارغ کر دیا۔ چٹان حیران ہوا اور کہا کہ کل ہی وہیں نے جان اور نوسار پر تکمیل کر چہار سال کو بچا لیا اور آج مجھے تو کرسی سے الگ کر رہے ہو۔ سیٹھ نے کہا۔ میں تمہارا احسان عمر بھر نہ بھولوں گا تم نے

کسی انکسپٹر سے مشابہت کا دھوکا ہوتا ہے کیونکہ اس وقت چنگی سے دو تین بہت دھٹی کتے بھی لگتے تھے۔ مجھے تعجب ہوا کہ کس چنگے کا انکسپٹر جسم کی روایتی فریبی کو اس طرح چمکا سکا ہے کہ میرے جسم کے مشابہ ہو جائے مگر یہ تعجب کا وقت نہ تھا۔ کتے بڑھتے آ رہے تھے۔ میرا دل کھٹا جا رہا تھا۔ انکسپٹروں کی لاگت کتنے ہوئے میں نے دلیرانہ کہا سناؤ کیا حال ہے۔ بلکہ کتوں پر عرب ڈالنے کے لیے میں نے ہاتھ بھی ملایا۔ اگرچہ سارے انکسپٹر ہاتھ نہیں ملایا کرتے "اب آپ یہ نہ بچھیں کہ یہ کتے کس نسل کے تھے۔" کوئی نسل ہوئی نا۔" چانچا میں نے کتوں کے خیال سے جوان کا حال پر چھا۔ اس نے کہا کیا تمہیں اس چٹان تک چینی تھی۔ وہ بھی ایک دن باغ والے نے بتایا کہ پاؤی چٹان چھوئی ہوئی ہے۔ عبد اللہ اس خاں کا آؤی چینی لینے آیا تو اس نے بھی یہی بتایا۔ اس نے کہا کہ کچھ کر دے دو مگر باغ والے نے کچھ کر نہیں دیا اور آؤی خاں اس چٹان تک دی۔ اب ہر آؤی تو عبد اللہ اس خاں کا آؤی ہے نہیں کہ اس کو ڈرا سکے۔ اب وہ پاؤی چٹان اپنے لیے چاہتا ہے۔ میں نے کہا "چپہ کا کچہ"۔ اس نے زرا سوچ کر کہا کہ چپو تو یہاں نہیں ہوتا۔ یہ سامنے پھاڑ ہے اس پر تو کھاس ہی ہوتی ہے۔ میں نے کہا ٹیل کے درخت کیوں نہیں لگاتے۔ کہا دو توئی بھر سر کا رقبہ کر لے گی۔ میں نے کہا ارے کچھ گوشے اگر تمہارا مطلب چھوڑ دینا چاہتے ہو تو وہ تمہارے ہی فائدے کے لیے چھبائی کرنا ہے۔ اس نے کہا جہاں جہاں ہم درخت نہ لگا دیں وہاں تو کوئی گھبائی نہیں کرتا نہ ہی خود درخت لگاتا ہے۔

آج میں جنگلات کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا کیونکہ اس سال مجھے کافی ٹیل کے درخت اور چلے گئے ہیں اور مجھے یہ خاص طور پر کہا گیا ہے کہ حماراؤ کو خیر نہ ہوتا چھاپا ہے اس لیے میں نے ذکر نہیں کر دیا گا۔ البتہ جنگلات کے ذکر سے مجھے ہم درختوں یا یاد یا ہم ہر سال سنتے ہیں کہ پاکستان کا صرف دو فیصد یا دو اعشاریہ ایک مضر مضر ایک (2.1001) فیصد رقبہ پر جنگلات ہے جو کم از کم پندرہ فیصد ہونا چاہیے۔ پھر سنتے ہیں کہ اس سال 6 اگست کو اس لاکھ بھڑ بھڑ چار سو اسی درخت کا شت ہوئے اور پندرہ فردی کو چار سو اسی کی بجائے چار سو اسی کا شت ہوئے وہ ایک فاقہ درخت میں سے کا شت کیا تھا اور جہاں تک مجھے اس ہال سے نظر آ رہا ہے صرف وہی ایک درخت اس وقت کھڑا ہے۔ اب میں یہ چھت ہوں کہ باوجود انجی کا شت کے جنگلات کا رقبہ 1950ء سے اب تک دو اعشاریہ ایک مضر مضر ایک ہی کیوں چلا آ رہا ہے؟ میں نے لاہور کی اس سرکاری جامہ اداک جیسے جی۔ او۔ آر کتے ہیں ذرا غور سے مطالعہ کیا ہے کیونکہ میں وہاں بیچ کھلدا کرتا ہوں۔ سڑک کے دونوں کناروں پر سڑکی کی چدرائی کے برابر گھاس کی بیلا ہیں۔ ہر ایک بیلا میں دو قطاریں درختوں کی ہیں۔ پہلے تو قطاریں کھلی تھیں۔ پھر چلے گئے کچھ درخت سوکھ گئے۔ سینگڑوں کی تعداد میں سوکھتے رہے بلکہ شرائط زبان میں سوکھا کس سرکاری لوگ سوچا گئے۔ سرکار خود بھی سوچتی رہی۔ سرکار ایسی باتوں میں موٹ بن جاتی ہے

رہے تھے تو ان کے انتظامی حلقے کی ایک تعلیم یافتہ خاتون ریڈیو سن رہی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ علف و قادیاری انگریزی میں تھا۔ انگریزی میں علف اٹھا یا جائے تو اسے آدنی توڑ بھی سکتا ہے۔ یہ بھی آپ کو یاد ہوگا کہ علف "آئی" سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی میں۔ اس کے بعد علف لینے والے کا نام آقا تھا اس طرح سے کہ "میں گل محمد" علف اٹھا تا ہوں کہ اپنے دوستوں اور پارٹی والوں کے ساتھ وہ قادیاریوں کا۔ وغیرہ وغیرہ۔ "ایسا ہی کچھ تھا۔ ویسے گل محمد کی بد نظریا دوزیر کا نام نہیں ہو سکتا مگر اے کے مارے کسی کا سہل نام نہیں لینا کہ وہ ناراض نہ ہو یا اس پر لہو EBD و کا ٹوکس جاری نہ ہو جائے۔ یہ بھی ایک قاتل تھا۔ آئے دن ہم ریڈیو پر سنتے تھے "آئی گل محمد" آئی گل خٹن۔ آئی لاڈو خانم مگر وہ تو ایک قاتل تھا اب اس کا گلہ بن گیا۔ آج کل گل محمدی رجسٹری ہوتا ہے اس کو لہو و کا ٹوکس کہتے ہیں۔ گلہ کی اس طرح کرتے ہیں دیکھئے ہاں سامع میرے! آپ نے دوران وزارت یہ کیا کیا وہ کیا تھا۔ علف و قادیاری میں تحریف کر کے دوستوں سے وہ قادیاری کا محاذ قائم کر لیا تھا میں نے سنا ہے کہ غالب نے جب قادیاری کی جی کی گلو کا قاتل کیوں بناتے ہو تو وہی لہو و کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ کیونکہ ایک نئے میں اس طرح بھی لکھا ہے۔

میں کرتے ہو کیوں دوزیوں کو
اک تماشاً ہوا گلہ نہ ہوا

تو میں آپ سے عرض کر رہا تھا کہ جب میرے بھائی علف و قادیاری اٹھا رہے تھے تو ان کے انتظامی حلقے کی ایک خاتون ریڈیو سن رہی تھی۔ چھ روز بعد یہ بتانے کے لیے کہ میرے پاس ریڈیو ہے اور میں پڑھی ہوئی بھی ہوں۔ انہوں نے میرے گھر آ کر یہ کہا میں نے سارا قصہ ریڈیو پر سنا ہے۔ پہلے جب ریڈیو نے کہا کہ "آئی ملک زمین" تو میں کچھ گئی کہ ملک زمین آگئی۔ میں مزاروف الفاظ کی مثال دے رہا تھا مگر مونٹ اور پٹانوں دوزیوں کے جھگڑے میں خواہ مخواہ پڑ گیا۔ دیکھوں کو چھوڑ کر عام لوگ تو مزاروف الفاظ کو اتنی جلدی سمجھتے ہیں کہ بعض ان میں سے عدالت کو بے انصافی کا مزاروف تصور کرتے ہیں۔ اچھا تو ٹکلیب اور تردیف کے عہد تراسل جنمیں کا ہے یعنی الفاظ کا ہم مضی ہونا اور واضح رہے کہ اس کا ہمضی حلق سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ ہم مضی الفاظ وہ ہیں جن کے اگر نکلے بنادے جائیں تو ایک سے نظر آتے ہیں۔ جیسے تیشہ اور وشہ۔ اس خبر کے بعد ہمارے گاؤں کے کسان نے یہ شعر پڑھا۔

تکلیب و تردیف و چنیس
دروئے یار خواہم خد شرقی

یعنی ان چمنوں کے درمیان میں اپنے دوست کے رخسار سے خد شرقی آگیا ہوں۔ آپ سمجھ گئے ہوں کہ کیونکہ یہ خد کی

یہ ساری باتیں قابلِ قہقہہ تھیں۔ اگر جنس سہا کو اس دفعہ بریکٹوں کا شوق نہ تھا تو نہ قہقہہ کا سوال اٹھتا اور نہ بات یہاں تک پہنچتی۔ اگر کوئی کہتا کہ میرے گھر اور چٹک کے درمیان صرف تین فٹ کا فاصلہ ہے تو میں سوچتا ہوں کہ ہمارے ضمیر اور ہمارے شیطان کے درمیان کیا فاصلہ صرف پانچ چھٹا کھٹن ہے یا اس مختصر مقرر طو کا طول و عرض جس پر چوڑی جی اور سرکار کا باقی معاہدہ اس طرح سے درج ہے کہ ہم آپ سے نہیں پوچھیں گے کہ ہم درختوں کے لاشے کہاں گئے؟ یا وہ فاصلہ جو جنس سہا نے بریکٹوں کے اندر والے اور بریکٹوں کے باہر والے مضمون کے درمیان رکھا ہے مثلاً جب وہ کہتے ہیں "ہمارا سماجی ماحول" اور بریکٹوں میں لکھتے ہیں "چند کا کچھ" تو وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا سماجی ماحول دشمن سے چھٹی ہو گیا ہے۔ آپ تو ممکن ہے یہ خیال کریں کہ اس طرح سے قابلِ قہقہہ کا ذکر نہ کوئی کتاب نہیں ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں کوئی اور یہ نہ کہہ دے کہ ہمیں اس کو قابلِ قہقہہ ہے جسے ہمیں منطقی کا رشتہ یاد آتا ہے یا یہ سوچتے تھے کہ تو سن بھی ضرور "کوئی ہو یا" کچھ سال میں نے جنوں کی زبان پر بھی کوئی قابلِ قہقہہ کر کے کہا تھا۔ "خاتم بہت ہی لوگ ترے شعر کے چاہتا"

مگر وہ خاتم تو صرف پھر مارنے تک محدود تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے الفاظ میں جتنی بھی وضاحتیں گے اور اس کی تلاش میں ہمارے گاؤں کے ملائی طرح سے آٹھ لکھ کام میں لائیں گے۔ جس ملا کا ذکر میں کرتا ہوں۔ وہ عالم قادیاری اور عربی پر عبور رکھتا تھا۔ اس نے مجھے شعر کی ان تین مشقوں سے آگاہ کیا۔ جن کو ٹکلیب، جنمیں اور تردیف کہتے ہیں۔ ٹکلیب کے مکمل سے الفاظ الٹ جاتا ہے اس لئے انقلاب کسی چیز کے الٹنے کو کہتے ہیں مثلاً مکلیب سے موش (م۔ واؤ۔ ش) کا لفظ شوم بن جاتا ہے ویسے چوہے تو جس نہ ہوں تو چر ضرور ہوتے ہیں۔ دوسرا تردیف کا دلیف کا ہے یعنی مزاروف ہوتا۔ دو ہم مضی الفاظ کو مزاروف کہتے ہیں۔ بخدا میں آپ کو پڑھانے کی کوشش نہیں کر رہا مگر اس بزم میں کچھ ایسے بھی ہوں گے جو دکھائی کی طرح انگریزی پڑھتے رہے ہوں گے اور اردو قادیاری سے ان کا سوتیلی ماں کا سا سلوک رہا ہوگا مگر وہ جیسے سوتیلی ماں ہوں اور اردو سوتیلی جٹا۔ اور اگر اردو مونٹ ہے تو سوتیلی جٹی۔ یہ تو میں نہیں جانتا کہ اردو مذکر ہے یا مونث البتہ یہ جانتا ہوں کہ اگر کسی پٹان نے کہا کہ میں نے اردو دیکھا ہے تو اردو دان بھائی اس پر فٹے گا اور کہے گا کہ اس کو اردو دیکھنا نہیں چاہئے۔ سمجھیں چاہئے بلکہ "سمجھیں چاہی دی اے"۔ مگر آپ کچھ کہیں پٹانوں کی اردو گرامر میں ایک ثابت قدی اور سادگی ہے ایک استعمال آئین اور قاعدہ کہ یہ وہ ہے کہ پٹان صرف مذکر کا صیغہ استعمال کرتا ہے اور پٹان عورت صرف مونث کا۔ اور اب تو چونکہ پٹان بھی مونث نہیں رکھتے اس لیے مرد عورت کی تیز صرف ان کی گفتگو میں مذکر تانیث کے استعمال سے ہوتی ہے مثلاً پٹان مرد کہتا ہے کہ میرا بیگ بھی اس پارٹی میں گیا تھا اور پٹان عورت کہتی ہے کہ دیکھو خدا ارٹی امیری صاحب بگھوڑتے سے آگئی ہے یا نہیں۔ "آ" یہ نہ سمجھیں کہ یہ میری بیوی نے کہا ہوگا۔ آخر پٹان بچ اور مٹی تو ہیں اور ان کو چھوڑ کر دوزیوں کے قصے بھی تو ہیں۔ میرے بھائی جب پہلی دفعہ وزارت کی سزا میں علف و قادیاری اٹھا

میں نے آخر کیا تصور کیا ہے؟

افکار پریشان (قسط سوم)

میرا تصور!

”مجھے شرم آتی ہے مگر.....“

صاحب صدر! غواہین و حضرات!

اگرچہ آج افکار پریشان کا تیسرا جہم دن ہے مگر آپ کی اجازت سے میں اسے بری کی حیثیت دینا چاہتا ہوں۔ اب قاتلہ پڑھنے کا وقت آ گیا ہے۔ خدا کی قسم کہ خیالات کو تین سال سے زیادہ پریشان نہ رکھے۔ تین سال کے بعد دونوں میں سے ایک کو ڈن کر دینا چاہئے یا ان افکار کو جو پریشان ہیں یا اس کو جو ان سے پریشان ہے۔ پہلی صورت زیادہ مرغوب معلوم ہوتی ہے کیونکہ دوسری صورت میں میں خود شریک جنازہ نہیں ہو سوں گا۔ اس کی تو کوئی بات نہیں مگر ایک ایسے ثواب سے جس کا میں جائز وارث ہوں! عرم رو جاؤں گا۔ اور اگرچہ آج کی تقریر کا عنوان بھی دستور سابق کے مطابق افکار پریشان ہے لیکن مناسب ہو گا کہ اس کا دوسرا نام یہ رکھیں۔ ”مجھے شرم آتی ہے.....“ مگر کسے لگے لگتی تھیں اس لیے کہ شرم کئی باتوں سے آ سکتی ہے۔ اک ذرا انسان میں شرم آنے کی صحت چاہیے۔

سب سے پہلے جب میں نے یہ فقرہ سنا تھا تو میں شام ڈھلنے کے بعد اندھیرے میں سوک پر جا رہا تھا۔ اندھیرے میں سے آواز آئی اور آواز کے پیچھے ایک آدمی کی شکل نظر آئی۔ اچھا خاصا نو جوان تھا! کپڑے بھی اچھے پہنے ہوئے تھے۔ اس نے کہا ”مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے مگر مجھے کوئی عذر دے رہا ہے اور علاقے کے لیے میری نہیں“ میری جیب میں پانچ روپے تھے ”حق تو زیادہ تھا“ مگر وہی دے دیئے۔ یہ پانچ روپے کا اعلان اس لیے کرتا ہوں کہ اگر آپ میں سے کسی نے مجھ پر اندھیرے میں حملہ کیا تو پانچ روپے سے زیادہ نہیں لیں گے۔ اور پھر بدنامی الگ ہوگی۔ اب تو مجھے پانچ روپے رکھتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ کچھ دنوں بعد مجھے پھر اس سوک پر قریب اسی وقت جانے کا اطلاق ہوا۔ اندھیرے میں سے پھر آواز آئی ”مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے مگر میرے

بات ہے۔ خدا کی بات ہو تو آپ جلدی سمجھ جاتے ہیں۔ غالب بھی محبوب کی خدمت سے پریشان رہ چکے ہیں۔ ”خدا کی بات ہے اور بات مگر غریب نہیں“

غرض میں شرعی کون تو آپ خدمت سے غریبی کہیں۔ بس خدا شرعی ہوئی غریبی۔ اور غریبی عمل تکلیف یعنی الفاظ کے اٹانے سے رابطہ بن جاتا ہے جو رابطہ کا تم نہیں ہے اور بہار کا ستر اوف ہے۔ بہار اور نہار ہم جنس ہیں۔ نہار اور ہم ستر اوف یعنی ہم معنی ہیں۔ ہم کو اٹھا دیں تو مومنے جان جاتا ہے یعنی ہال سے غریبی میں شعر کہتے ہیں۔ شعر مثل جنیس سے شعر بن گیا جس کو بھیجی دیت بھیجے ہیں۔ دیت کے معنی مگر بھیجی ہیں اور مگر کو دار بھی کہتے ہیں۔ دار کو ان کا تو راہ نام لگیا۔ راہ راہ راہ ہم جنس ہیں۔ راہ راہ تو آپ نے سنا ہوگا۔ اس کو تو ش بھیجی کہتے ہیں۔ تو ش کے نقطے ہٹا دیں اور ایک نقطہ ”ب“ بنانے کے لیے نیچے ڈالیں تو بوسہ بن جاتا ہے۔ گویا شاعر دوست کے رخسار سے بوسہ مانگتا ہے۔ شرم

مگر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے سادہ خیالات کو سمجھنے کے لیے نہ خیالات کو اٹانے کی ضرورت ہے نہ یہ جاننا کہ جب میں تو ش کہوں تو آپ اس سے بوسہ سمجھیں ویسے آپ کو بوسہ چاہئے تو کس نے روکا ہے۔ جو کچھ میں کہتا ہوں یہ ایک تسلسل خیالات کی مجبوری ہے اور تسلسل خیالات ایک نفسیاتی کیفیت ہے جس میں خیالات اسوانج ہر کی طرح ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ مویں آپ میں لگرائی ہیں تو ان سے تمنا میں ٹوٹ کر پھواری کی طرح برتی ہیں۔ یہ ایک اور نفسیاتی کیفیت ہے جو آپ کی توجہ اور ہمدردی کی طالب ہے۔

تر ہے مرے آنسو سے گریبان چنا
مجھ سا بھی نہ کوئی ہو پیشان چنا

اب میں اپنی ہمدردیوں کا طالع کروں جو جنس سجاد کے مطابق بڑے مہرے کی ہیں یا آپ کی پریشانیاں کا جو اس مہرے کے نہ کیے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں

”چپکنا کا خیم“



شروع کیا آپ کیا کام کرتے تھے۔ میں نے کہا "سینئر مینیجنگ کام کرتا تھا" کچھ سوچ کر اس نے کہا "دیکھو سی۔! کمال کیا۔ میں نے پوچھا "کس نے کمال کیا؟" اس نے کہا "دیکھو سی اپنے اپنے ساتھ علم الدینی لے کر آتے ہیں۔ بیج تو آپ تھے ہی۔ آپ کے بچے نے دونوں جنموں کے درمیان ایک بڑے معروف اور ایک داؤد بھول ڈال دی تاکہ آپ معروف طبقوں میں بھول رہیں اور "اڈا غاٹھم اہل طہون کا لوسلا" یعنی جاہلوں میں اپنے کو بے بس دیکھو کو میرا رقم پر سلام۔ کیونکہ ای میں ملاقاتی ہے۔

القصہ اسدو کیمتہ تھا کہ میں پودوں کا شوق رکھتا ہوں اور ایک جگہ سے نکال کر دوسری جگہ لگا ہوں۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ جنٹرچ پودوں میں سے ٹیٹس جو ایک جگہ سے نکال کر دوسری جگہ لگائے جا سکتے ہیں مگر اسدو کو یہ معلوم نہیں اس نے میری غیر ماضری میں گھر والوں سے کہا "مجھے شرم آتی ہے مجھ کو کہتے ہوئے عمرو جنٹرچ کے پودے کافی بڑھ گئے ہیں۔ اگر کچھ کھیں گے کچھ چاہیں تو بے تکلف لگا دیں۔" مگر جب یہ سن کر میں ہنس اوروں سے استیصال نہیں کئے تو اس نے ایک دن کہا۔ "مجھے شرم آتی ہے مجھ سے کہتے ہوئے عمرو جنٹرچ میں کھیاں بہت ہو گئی ہیں۔ مجھ سے کوئی کہے کہ ان کو پیسے کے درخت کھڑے کروں۔"

میں نے سوچا یہ غرور دشوار مقام پر مشکل کشا بن سکتا ہے اور کیوں نہ آج میں بھی اس پر غور کروں۔ اس لیے مجھے یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ مجھے شرم آتی ہے۔ ہر سال یہ کہتے ہوئے کہ میں یہ تقریر کس بات سے شروع کروں کس بات پر ختم کروں اور کچھ میں کون سا سرخ پڑھوں۔ کیونکہ ٹیٹس سجاد احمد جان نے چھ مرتبے دے دیے ہیں۔ ان عنوانوں کو سرخ اس لیے کہتا ہوں کہ وہ اولاً آخراً ظاہراً باطناً علویاً و کبراً جہاں آقا و ائمہ علیہ السلام نے ان کے مضمون ہیں۔ مثلاً قوم کے نام کا خطاب یا امام رفیع اور ازادوں کو کس سناؤں کوئی سنا ہی نہیں۔ عنوان کیا ہیں بادل کا خاستان ہیں جہاں جہاں قدم رکھوں گے کائنات چھینے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا یہ جنگل میں تھوڑے دن ہوئے تھیں ماضی نگاہوں دروازہ تاج پڑتا تھا۔ پاؤں سے کانٹا کٹانے کے لیے بیڑا تو لٹلی کا تو نظر سے غائب ہو گیا۔

رقم کہ غارہ یا کشم: حمل نہاں شہادہ نظر

یک لفظ غافل سقیم و صد سالہ رانیم دور شد

کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں بھی قبض ماضی کی۔۔۔۔۔ میرا مطلب پاگل ہونے کا نہیں کانٹا کٹانے کا ہے۔ مگر اتنی فرصت کہاں۔ آپ کو میرے پاؤں کے کانٹوں کے ساتھ ساتھ چٹان پڑے گا اور کانٹوں سے بچنے کے لیے آپ نے بوٹ پہن لئے۔ تو میں غار کی کی کی ہائے خار پہلوں میں جاؤں گا جس کی ٹھک سے آپ کا دل بھی محفوظ نہیں رہ سکے گا۔

اگلا مرحلہ ہے حالات حاضرہ کے تقاضے۔ ایسے مرحلے سے کہا ہے مجھے کوئی کہتا ہے جو ان کے حوصلے کے حامل اور۔۔۔۔۔

بچے کو فلاح ہے۔ دو سال کا تھا جب اس کی ماں چل بسی تھی۔" میں نے شرمانے کی آواز بچکانہ لی اور کہا کہ ان کو تو کچھ دن پہلے دق باری تھی؟ اس نے بھی میری آواز بچکانہ لی اور کہا "مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے عمر مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ وہی ہیں۔ میں معافی چاہتا ہوں۔"

اس کے بعد کئی سال تک یہ آواز نہیں سنی۔ اب کوئی تین تینے ہوئے ہوں گے ایک بہت سالہ بچے سے بھرپور غور نہاں اس کا کام اسدو ہے۔ میرے بڑے بھائی کے بڑے لڑکے کا بڑا لڑکا ہے۔ اس نے کچھ جنٹرچ کے کچھ زمیں میں پیچھے سے جو زمین میری سات آہٹ آہٹ اوٹے ہوئے۔ بعض پودے جلد اوٹے ہو جاتے ہیں۔ بعض انسان بھی جلد اوٹے ہو جاتے ہیں مگر جنٹرچ جڑ استوار نمی ہوتی۔ کسی بھی ایسی چیز کی جڑ استوار نہیں ہوتی جو جلدی سے اوپر جانے کی کوشش کرتی ہے۔ آپ کو بھی اپنی جڑیں اپنی بنائیں استوار کرنی چاہئیں۔ آپ تو اب ماشاء اللہ اوٹے درختوں کی طرح ہیں جن کی اصلاح آسانی سے نہیں ہو سکتی۔ اپنے بچوں کی ویدیاں راقی پڑھیں۔ ان کی نشوونما میں کوئی بھی ایسی نظر آئے تو اسے کاٹ دیں۔ درخت سیدھا تھا تو خود بخود صورت معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے سوچا ہے کہ سیدھے کے سارے محاورے تنکی کے ہیں۔ مثلاً سیدھا گھر خدا کا سیدھی بات کرنا۔ سیدھی چال چلنا اور نیز چال چلنے کے سارے محاورے بڈی کے ہیں مثلاً نیز چلی آکھ سے دیکھنا نیز چلی چال اور نیز چلی کھیر۔ اور اگر میرے افکار بونچی پریشان رہے تو تھوڑے دنوں میں فرنی بھی نیز چلی ہو جائے گی۔ اللہ خدا نے فرنی فرمادیاں۔ یہ مصرعہ لا جواب ہے ابھی ابھی صلیت نے حاضر کیا ہے۔ دوسرا مصرعہ اس وقت غیر حاضر ہے اور بات یہ ہے کہ فرعونیت کی فرنی کمانے والوں پر شرکنا نیز چلی ترین کھیر ہے۔ لہذا آپ یہ سمجھیں کہ دوسرا مصرعہ 1957ء میں خدائے رب میں تلف ہو گیا۔

بات جنٹرچ کے پودوں کی بوری جی جو چھوٹے انے کاشت کئے تھے وہ مجھے نیچے (جی) کے نام سے پکارتا ہے۔ اس لفظ کا ذوق تو کوئی ناغہ ہے اور نہ اس کے کوئی معنی ہیں۔ شروع میں ایک بچے نے بولنے کی ابتدا اس طرح کی کہ مجھے کچھ جتنا شروع کیا۔ اس کے بعد سارے بچے سنت طغیان کے طور پر یہی نام دہراتا رہے۔ دوسرے لڑکے نے خیم ابدل کے طور پر مجھے بیان کہا (ب' پ' ڈا) والد مرحوم نے سنا تو فرمایا کہ بچہ بیان کہتا چاہتا ہے جو کسی زبان میں بند کر کہتے ہیں۔ ساتھ ہی فرمایا کہ لڑکے کو ہشیار ہوتے ہیں بچکانہ لیتے ہیں۔ لڑکا کچھ بھشیار تھا۔ اس فریخیں نہ ہو۔ جب زرا تا یاد ہو ہشیار ہوتا تو چنان کہتا چھوڑا مگر کچھ کا نام اب تک میرے ساتھ لگا ہوا ہے۔

بعض لوگ ہر لفظ کا ماننا ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ ایک دوست نے مجھ سے پوچھا کہ ان دنوں میں جب مجھے لڑکے سے مجھے کہنا

جلدی میں کسی مریض کو شفا دینے میں دیکھنے چلی گئی تو مریض کے رشتہ داروں نے بچہ چھو "ڈاگ دار" خود کیوں نہیں آئی۔ دانی کو بھیجے کا کیا مطلب۔ جب اس نے بتایا کہ میں ہی ڈاکٹر ہوں تو انہوں نے شکار کے پانچوں سے قبض کی گردن تک منگوا کر لکھا ہوں سے دیکھ کر کہا "پہ آپ نے شادی تو نہیں پہلی۔" اس نے فک دفع کرنے کے لیے کہا کہ سارا ہی ہم اس وقت پہنچے ہیں جب مریض کی حالت خطرہ کا ہو۔

وہ دفعہ انھیں اب تو سارا ہی قریب آگیا ہو گئی ہے۔ اب اس کو دعویٰ کہتے ہیں۔ اس نے بھی دل پہنچنے پہنچنے کو نہیں چاہتا مگر ان دنوں اوج صحت کا سارا صیوں پر ہی گزرا کرتا تھا اور وہ خواتین جو پردے کی سرحد پر تھیں اور کبھی انہیں سرحد سے گزرتا ہوتا تھا پاسپورٹ کے طور پر سارا ہی مہین لیتی تھیں۔ ایک خاتون خاندان کی غیر موجودگی میں سفر کر رہی تھیں۔ کسی جنگشن پر جہاں گاڑی ان سے گاڑی اٹھ گئی اور ان کو رات رات تک دم میں گزارتی رہی۔ رات تک دم میں پہنچ کر انہوں نے برقع پہنک دیا۔ سارا ہی مہین اور جنگشن ماسٹر کو بلا کر کہا ہمارے لیے کھانے کا انتظام کرو۔ غالباً جنگشن ماسٹر کو اگر برقع کے اندر سے خطاب کیا جاتا تو وہ یہ نہ سمجھ سکتا کہ ایک لیدی اس سے خطاب ہے وہ یہ سمجھتا کہ کوئی عورت بول رہی ہے۔ وہی قصہ ہوتا کہ ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ دوسرا مصرعہ خطاب کے غیر مطلوبہ کالم کے قبیلے سے ملا ہے "ہم بھی برقع میں شان رکھتے ہیں۔" مگر وہ بارہ کی سارا ہی زیادہ عمر سے نہیں رہی۔ مشکل یہ تھی کہ سارا ہی ہاتھ منے کے لیے دو عورتیں دیکھتی پرستی تھیں۔ ایک خادمہ ایک سرائے کے ریکم صاحبہ کے قریب کھڑی ہو جاتی اور دوسری خادمہ دوسرا سرائے کھڑی ہوتی اور بارہ کو قہر کا دائرہ دنگ کے گرد دیتی۔ یہ دائرہ بارہ پر چکر پر چلتا جاتا مگر تیسرے چوہے تھیں پھر میں تھیں صاحبہ کو فک ہوتا کہ اوپر فضا میں کوئی گز رہا ہے اسے آواز دے کر کھے ہاتھ اس اور بھی میں بھی سارا ہی کی لپیٹ میں آ جاتا۔ اسے میں ترو کے باوجود ڈاکٹر جب آ کر دیکھتی تو کبھی مسکراتی اور کبھی ہنس دیتی۔ اسے اگلے سال اس سے لڑکیوں کے لیے دو تین جڑے شکار تھیں کے بنا دیے گئے تھے تو اپنے لیے ایک باجہ سوٹ خواتین چاہتا تھا مگر درزی نے مخالفت کی اور کہا کہ یہ بہت زائد پکڑا ہے۔

ہمارے خاندان میں پشت در پشت بلکہ ایک ہی پشت میں بھی بزرگوں کے کپڑے پہننے کا رواج تھا کچھ کا قلم ہے۔ 1935ء میں میری ایک لڑکی لاہور میں سکا ورمیج کے کانوینٹ میں پڑھتی تھی۔ وہاں اس کو پہننے کے لئے شادی نسل کا یو نظام ملا تھا۔ جب وہ یو نظام کے سائز سے بڑھ گئی تو اس کے چھوٹے بھائی نے اسے پہنانا شروع کر دیا۔ وہ اس کا کانوینٹ میں تو نہیں تھا مگر کپڑا اگر ہم تھا اور نرم بھی۔ ساری سردیوں میں کام آیا۔ جب وہ بھی بڑھ گیا تو قریباً سات سال کے بعد اس کے چھوٹے بھائی نے پہنا۔ میں بچوں

صاحبہ لکھتی جانتے ہیں کہ حالات حاضرہ کا ایک کشادہ خیالی تھا کھٹن کی کیا ہے۔ کشادے کے لفظ پر تو مجھے حزم مدہ "جر ارا" کا وہ سوال یاد آ جاتا ہے انہوں نے ازراہ استفسار نہیں بلکہ ازراہ زینت رسالہ کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اردو زبان کا موجودہ رسم الخط کسی تبدیلی کا مستحق ہے؟ میں نے جو جواب دیا اس کی نقل تو میرے پاس نہیں ہے مگر وہ کچھ اس طرح پر تھا کہ اردو رسم الخط نے خود کو کوئی کشادہ نہیں کیا کہ مجھے بدلا جائے تو آپ کی بھی رضا ہے تو پھر اردو کی فضا ہے۔ البتہ انسان کی فطرت اس بات کی منتظر ہوتی ہے کہ کچھ یوں ہمیشہ بدلتی رہیں۔ کوئی اس کو حدت کہتا ہے کوئی بدعت اور کوئی تو انتہا ہے کہ وہ بے تک پہنچا دیتا ہے۔ میرے دوست پروفیسر محمد منور نے جو زیادہ انتہا کے قائل نہیں ہو سکتے "مسلطہ" میں انہیں تو طریقہ تحریر میں اتنی تبدیلی کر دی کہ جہاں آپ اور میں دائیں جانب کو لکھتے ہیں یعنی مشرق سے مغرب کی طرف وہاں وہ جنوب مشرق سے شمال مغرب کی طرف جاتے ہیں اور آدھا مسلطہ کھڑا شمال مشرق سے جنوب مغرب کا رخ کرتے ہیں۔ اب چنگ آگے آپ کو اردو کی تبدیلی نہیں سمجھتی کیونکہ یہ بھی "جس سہارے" حالات حاضرہ کا کشادہ ہے اور شادی یاں بھی چارے سے یک نیت ایک ہونے پر آپ "اقل حد یہ لڈی" کی لذت سے محروم ہو گئے ہیں اس لیے عرصہ اردو کو شریک حیات سمجھ کر اپنے بعض میلانوں کی تسکین کے لیے اس کو اردو کا فراق پہنا میں۔ جن لوگوں کو آپ کی اور میری طرح صرف ایک شادی تیسر ہوئی ہے تو خواہ اس وجہ سے کہ وہ چار مکان نہیں رکھتے خواہ اس لیے کہ ایک ہی زبان رکھتے ہیں اور وہ بھی منہ کے اندر جب شاعر نے یہ کہا تھا "میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں"

تو میں نے اعتراض کیا کہ زبان تو ہوتی ہی منہ میں ہے "سرسیم تو ہوتی نہیں لڈی" یہ مصرعہ غیر ضروری ہے تو اس نے دوسرے مصرعہ میں جواب دیا کہ بعض لوگوں کی زبان منہ سے باہر ہوتی ہے اور اگر میری بھی باہر ہوتی تو گنہگار احوال کرتا اور کاش چھوٹی ضرورت نہ تھی کیونکہ میں بغیر بچے ہی مدعا بیان کر دیتا۔

تو میں آپ کو ہیڈ رات رات ہاتھ کر جن لوگوں کو ایک ہی بیوی میرے دوے بھی فراق پہناتے ہیں اور کبھی سارا ہی اور اس طرح سے فک میں حدت پیدا کر دیتے ہیں۔ کبھی ہال بھی کھوادیتے ہیں اور گنہگار میں تو کبھی تصور رکھنے ہالوں میں کھنچتے ہیں اور کبھی ہال ایسے سخت بندھے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے ان پر استری کی گئی ہو۔ ہم نے جب پہلی دفعہ اپنی تھیں صاحبہ کے لیے سارا ہی خریدی تھی تو نہیں جانتے تھے کہ کتنے گز کی ہوتی ہے۔ مقامی درزی نے کہا کہ بارہ گز ہوتی چاہے کیونکہ میں اس کی لپیٹ ہوتے ہیں۔ اس نے نہیں سوچا کہ سارا ہی کا مضمون اگر مونا ہو تو بارہ کی ہتھی ہے چھ لپیٹ آگیاں گے۔ بہر حال بارہ گز کپڑا خریدنا اور پھر ہاتھ منے کے لیے ایک لیدی ڈاکٹر کو بلا دیا کیونکہ ان دنوں سارا ہی کا تصور بغیر لیدی ڈاکٹر کے نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک دفعہ ایک ڈاکٹر نے

زندگوئوں کے لئے آرام کا باعث بن سکے ہیں۔ جس شخص کے لئے اللہ نے رسالت رکھی تھی اس کو بھی ساری رات جاگنے کا حکم نہیں تھا۔ ”یا صبا المولت“ اظہار اور رات کو عبادت کرو نصف رات یا کم و بیش ”کم و بیش“ اس لئے کہا کہ کبھی رات میں بھی سوئی ہیں اور نیند کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی اور کبھی چھوٹی ہوتی ہیں اور پھر آگے جا کر فرمایا کہ تمہارا رب جانا ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی عبادت میں بھی دو تہائی رات ”بکھی“ آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات گزارتے ہو مگر ”عظم ان لن تحصو و لعلب بملکم“ اللہ جانا ہے کہ آپ اتنا نہیں کر سکتے اس لیے جتنا ہو سکے کریں کیونکہ فیض آپ میں ہے پتا ہے اور بعض رزقی لحاظ میں بکھرتے ہیں اور بعض اشد کی راہ میں لڑتے ہیں تو کیا اس میں وہ لوگ شامل نہیں جو گورنر کا کام کرتے ہیں۔ یا مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہیں اور آپ ہی سوچیں کہ اگر ایک گورنر یا کوئی بھی عامل ساری رات جاگتا رہے تو دن کے وقت وہ خدا کے بندوں کی ضروریات کو کتنی تو جد سے نکلے گا۔ تین چار دن میں وہ صاحب فراش ہو جائے گا اور پھر ڈاکٹر لوگ اسے بستر سے مضبوط یا باندھ دیں گے اور حکم دیں گے کہ کھانا چٹا چھوڑ دو البتہ پھلوں کا رس بننا کر۔ سیب کا رس خصوصاً اس موسم میں جب سیب نہیں ملتا۔ دوسری آم بھی ملے تو کھادو عمر آؤ نہ کھادو۔ آؤ ایک پشاور کی چٹیل ہے اور پشاور میں بہشت نگر کے لوگ دراصل بنی اسرائیل ہیں جو سن و سلی چھوڑ کر آؤ نہ کھانے لگے تھے۔ آؤ کے علاوہ دال بھی بری چیز ہے (یہ پیش ڈاکٹر لوگ اسے روایت کر رہے ہوں۔ آؤ اور دال دونوں سے پیٹ بھی خراب ہوتا ہے۔ غالباً انکار پریشان ہونے کی بھی کہیں جابجہ۔ دال کی بجائے کوئی کم قیمت جنس اتریم مرغ یا مرغی کھایا کر اور ناغہ بھی نہ کرو۔ جلد بنی اسرائیل نے کیا تھا اور نہ تھے اس کی پچھلیاں جمع ہو جایا کرتی تھیں۔ قیوب ہے کہ شاموں کا ذکر تو قرآن مجید میں آیا ہے مگر ڈاکٹر اس کا نہیں آیا۔ میں اس بات پر حیرت کر رہا ہوں اور پھر آؤ ناغہ گوشتنا اور کپڑے خود دھونا (گورنر سعید کا ذکر کر رہا ہوں) یہ تو جیسے کوئی بہانہ کرتا ہو یا جی کو کام کرنے سے روکتا ہوتا کہ اس کے ہاتھ صحت نہ ہو جائیں حالانکہ آؤ ناگہ مٹنے سے ہاتھ نرم بھی ہو جاتا ہے اور سفید بھی۔ یہ فیک ہے کہ دال اور بنیان کی حد تک تو کبھی کبھی میں بھی کپڑے دھو لیتا ہوں لیکن میں نے اگر اتوار کے دن کا ہاتھ وہ کپڑے دھوئے شروع کرے تو پھر جو تھکے ہوئے آئے گا اس کو بھی ایک آدھ کپڑا دھونا پڑے گا۔ ساتھ ساتھ اپنی بات بھی کرتا جائے گا۔ اگر اس کی بات ناخوشانہ پڑے برائی ہوگی تو کپڑے دھائیں گے کہ کہہ دوں گا کبھی تم بن تو رہے ہو اے بن تو کسی مسلمان دھوئی نے بھی نہیں تو رہے تھے۔

اب اسودہ حسد کی طرف پھر رجوع کرتا ہوں۔ میں نے انہیں پڑھا تھا کہ معاشرت سیاست اور فکری دنیا سے کہیں زیادہ گہرا انقلاب دہو تھا جو حضور رسالت مآب نے دلوں کی دنیا میں پیدا کر دیا تھا اور اس کا حقیقی ذریعہ حضور کا بلند ترین کردار مقدس ترین سیرت

سور سے سورج چڑھنے سے پہلے اپنا سرکاری کام شروع نہیں کرتا دوسرے رات کو ان کی بکھر گئی کہ پڑائیں آتا تیسرے مہینے میں ایک دن چھٹی بجی کر لیتا ہے اور پھر گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ گورنر نے پہلے اعتراض کیا کہ جواب دیا کہ میرے گھر والوں کے پاس کوئی خادم نہیں۔ اس نے اپنے آقا خود کو مدحت میں اور روٹی پکانے کے بعد کام شروع کرتا ہوں۔ لیکن یہ روٹی پکا کر کھا بھی لیتا ہوں۔ حضرت عمر نے فرمایا ابھی یہ تو ناچا کرتے ہیں۔ آقا گوشت کے کاڈ کر قرآن میں ”انما الخمر والمیسر“ یعنی شراب اور جوئے کے ساتھ تو ہوا نہیں بلکہ آقا گوشت کے کاڈ کر سر سے پہے ہیں۔ پھر آقا گوشت میں کیا حرج ہے؟ حکایت کنندگان نے کہا چلو نہ سہی۔ دینے کوئی ضرورت تو نہیں کہ کھانا کھاری کام شروع کیا جائے۔ رسول اللہ کو بعض دفعہ تین دن کھانا تیسرے نہیں ہوا تھا اور پھر گھر والوں کے پاس خادم نہیں تو یہی آقا گوشت سے۔ گورنر صاحب خود کیوں گوشت دیتے ہیں۔ یہ آخری دو تین یا تین انہوں نے نہیں کی تھیں میں نے اپنی طرف سے حصے میں ایذا دی ہیں۔ مگر یہ ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا کہ ضرور گورنر سعید پر کروں یا نہ حق حکایت کرنے والوں پر۔ بہر حال انہوں نے دوسرے اعتراض کی طرف رجوع کر کے کہا کہ رات کو ہماری بکھر گئی کہ جواب دیا کہ میں جیتے۔ سعید اگر یہ جواب دیتا کہ رات کو تو میں سو جاتا ہوں کیونکہ صحت اچھی ہے اور برقع کھینچنے کی عادت نہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ مگر اس نے کہا یہ بتانے میں مجھے شرم آتی ہے کہ میں نے رات ساری کی ساری اپنے رب کے لئے مخصوص کر رکھی ہے۔ حضرت عمر نے ان لوگوں سے پوچھا اب کیا کہتے ہو۔ انہوں نے کہا چلو یہ بھی نہ سہی۔ مگر میں نے ایک دن چھٹی کیوں لیتا ہے۔ جواب ملا کہ اس دن میں اپنے کپڑے دھوتا ہوں اور شام تک گھر بیٹھا ہوں تاکہ کپڑے خشک ہو جائیں۔ راوی لکھتا ہے دیکھو یہ اسعدیہ ایک گورنر کا نام ازم ایک مشہور بہر صورت تھا مگر بلا جبرگی تو نہیں رکھتا تھا۔ آقا خود کو مدحت پکڑے خود دھوتا آپ بھی کن کر کہہ دیتے ہیں کہ یہاں اللہ کیا لوگ تھے دن دن کو سوتے تھے نہ رات کو میں بھی چودھری نذر احمد خاں کے ڈار سے اتفاق کروں تو اور بات ہے کیونکہ انہوں نے جب میری باتوں میں غلطی گئی محسوس کی تو فوراً آگاہ کیا کہ کسی دن کوئی فتویٰ صادر ہو جائے گا۔ مگر یہ میں پوچھتا ہوں کہ آپ انسانوں کی باتیں سنتا چاہتے ہیں یا فاقو البشر کے اپنے اقل پر ہونے پر دھڑکنے میں جس کا سایہ آسمان اور زمین کے مقام اتصال پر نظر آتا ہے مگر کیا آپ نہیں جانتے کہ آسمان اور زمین کبھی نہیں ملتے۔ میرا مطلب ہے کہ بشر اپنے ساتھ چند ضرورتیں لے کر آتا ہے مثلاً بھوک پیاس تھک۔ دوسرا زمین اس کو خدا نے ہی دی ہیں۔ ان کی تسکین کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے یہ فوضہ عمل کہ ساری رات جاگا کر وہ لوگ کیا خواص کے لیے بھی قابل نہیں ہیں۔ صرف خدا کی تعریف ہے کہ نہ اس کو خیر آتی ہے نہ نہ اچھا نہ کافرا نہ خداوند۔ والہم اور خود غریبا کیا کہ رات اس لیے بنائی کہ تم آرام کرو (عبداللہ عظیم الشان لکھنوی نے) مگر یہ عیدین میں حاضر ہو کر آدمی اس آقا اور

جی جی جی بولنے کی تحقیر کرتی ہے اور ذاتی خیانت سے منع کرتی ہے۔ بس آپ یہ چھوٹی سے بات اپنے ذمہ لے لیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ ایک بڑی قوم بن جائیں گے۔ مگر کسی دن آپ اس بات پر میرا مواخذہ نہ کر نہیںیں میں کوئی دلی تو ہوں نہیں کہ اس بڑے دربار میں میری رسائی ہو جہاں بڑی قوم بنائی جاتی ہیں اور یہی ہماری قطعی ہے۔ جب کوئی شخص منزل آتی ہے تو ہم کہتے ہیں میں دلی یا پھر تو ہوں نہیں یہ بھولنے ہیں کہ دلی اور پھر اولوالعربی سے بنے تھے۔ اولوالعزم کا لفظ بھی قرآن مجید میں آیا ہے مگر کیا صرف پیغمبری صاحبان عزم ہو سکتے ہیں اور آپ کے لیے بس یہی دور گیا ہے کہ جیوں کے کامل معرفت کا ذکر کر بھی سمجھ کر بھی آزمائشوں کے سیلاب میں گرفتار ہو جائیں پانی سے تر نہ ہونے دیں مگر اس وعدے سے جو میں آپ سے کر رہا ہوں کہ آپ اگر ذاتی انصاف میں راست باز ہو جائیں تو ایک بڑی قوم بن جائیں گے مجھے اس ملا کا وعدہ یاد آیا جس نے کسی بے لگازی سے کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر چالیس دن حوازا نماز پر قنوت انعام دیں گا۔ جب چالیس دن حوازا نماز پڑھنے کے بعد وہ انعام کے لیے آیا تو حوالہ لے لیا کہ الودی دم اور گدھے کے سم اٹھیں تو تمہارے گناہوں کی بات کی تھی۔ میرا مطلب یہ تھا کہ چالیس دن نماز پڑھ کر لو اس عادت پڑ جائے گی کہ پھر نہیں چھوڑے۔ نمازی عادت خود بخود را بہترین انعام ہے۔ بے لگازی نے کہا تو گویا آپ نے میرے ساتھ دھوکا کیا اور اب وعدہ خلافی بھی کر رہے ہیں۔ چلو نہ کسی۔ میں نے بھی نمازیں بغیر وضو کے پڑھی تھیں۔

دنپاری اعمال بھی اس وقت تک چل نہیں لاتے جب تک صاحب محل با وضو نہ ہوں۔ وضو سے مصل جسم کی پاکیزگی مراد نہیں بلکہ اس کا مقصد کسی کام کرنے کی تیاری اور ارادہ ہے۔ وہ ارادہ بذات خود خدائے تعالیٰ کا موجب بنتا ہے۔ اس ارادے کی پہچان کیا کہنا کہ ذرا بھی مخالف ہو جائیں اور ارادہ ٹوٹ گیا۔ آپ اس کو وضو کا ٹوٹنا کہتے ہیں۔ میری زبان میں میں ہوائے مخالف وہ خارجی عظمت ہے جس سے ارادہ کمزور ہو جاتا ہے۔ یعنی جس ارادے سے آپ نے ایک اچھا کام شروع کیا تھا وہ دیگر رعایتوں کے آنے سے ٹپک ہو جاتا ہے اس نفسیاتی مشکل کو مثال دے کر ذرا آسان نہ کروں۔

چھپتے بظن میں لاہور میں تھا۔ شام کے وقت میں باغ میں کام کر رہا تھا کہ سڑک پر کسی کے کرانے کی آواز آئی۔ میں نے اپنے جعدار سے پوچھا کیا بات ہے؟ اس نے کہا کیا کپڑا لے کے بیٹھ میں تختہ دروہا تھا جس سے وہ بپوش ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کو گھر پہنچاتا چاہیے۔ اس نے کہا گھر کا پتہ نہیں معلوم۔ لوگ گزرتے ہوئے ذرا مہر جاتے ہیں پھر اس کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا چلو ہسپتال ہی پہنچا دیں۔ مگر جوں جوں میں سڑک کے قریب ہوتا گیا میرے دل میں یہ وہم بڑھتا گیا کہ اس لڑکے کو ہیضہ ہوا تو مجھے جی تپاری لگنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ میرا ارادہ کمزور ہو رہا تھا۔ اس میں خارجی عظمت پیدا ہو رہی تھی۔ اس شش و پنج کی حالت میں میں موقع پر پہنچا ہوا دیکھا کہ ایک موٹر پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور لڑکے کو موٹر میں لاد دیا گیا تھا۔ ایسے وقت

جی۔ ایک مغربی مصنف نے لکھا ہے کہ حضور نے کبھی بھی دعویٰ نہیں کیا کہ انہیں غیر معمولی قوتیں حاصل ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو ایک عام انسان اور خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے پیش کیا۔ جو کچھ اثر انہوں نے اپنی قوم پر ڈالا اسے اپنی عقلی کردار سے ڈالا۔ آپ نے پڑھا ہوگا کہ ایض لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ کیا رسول ہے جو خود ہزار سے سو ڈالاتا ہے۔ اعتراض کرنے والوں کا مقصد یہ تھا کہ جب کوئی فرشتہ ان کے پاس آتا ہے تو کیوں اسے سبزی یا کپڑا خریدنے کے لیے نہیں بھیج دیتے اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو آپ کے ہزار میں جا کر سبزی یا کپڑا خریدنے کے لیے آپ کے غلے پر حمل کرتے ہیں۔ یہاں آیت آباد میں میرے گھر سے ملحق ایک سڑک گزرتی ہے جس پر آنے والے مجھے مانی کا کام کرتے دیکھتے ہیں۔ ایک شخص نے ایک دفعہ ہمدردی سے پوچھا آپ کے پاس مانی نہیں ہے؟ میں نے کہا ہے تو۔ مگر میں خود بھی کام کرتا ہوں۔ اس نے پوچھا آپ خود کیوں کام کرتے ہیں؟ آپ کے ہاتھ سخت ہو جائیں گے۔ میں نے کہا ہاتھ سخت ہو جائیں تو دل نرم ہو جاتا ہے اور پھر کیا معلوم آگے جا کر دنیا کی کیا حالت ہو۔ زمانے نے کوئی انقلابی کرہ نہیں اپنے ہاتھوں کے پھالے دکھا کر یہ کہہ سکوں کہ میرے تو ہاتھ بھی مزدوروں کے سے ہیں اور دل بھی مزدوروں کا ہے کیونکہ میں بھی کبھی کام سے ہی چھڑا ہوں ویسے یہ چھالے جو ہاتھوں پر نظر آ رہے ہیں دل پر ہونے والے نہیں مگر دل پر چھالوں کا اتنا حجم ہے کہ وہاں جگہ نہیں رہی۔ وہ آہ پروری کے اس قلعے کو نہ سمجھ سکا۔ جب دو تین بظن مجھے اسی طرح کام کرتے دیکھتا تھا تو اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ جاتے جاتے یہ سنا گیا۔ "جناب امالی رکھو۔ مانی۔"

جب کسی دینی اور مزدور میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ اپنے ہاتھ سے کام کرنا چھوڑ نہیں تو اس کام پر اس کو فخر کیا خاک ہوگا۔ یہ باتیں ہیں جو آپ میرا عبادت الہیہ کے علاوہ بھی جہاں نہیں لوگوں سے کہہ سکتے ہیں تاکہ ان میں وہ ذاتی انقلاب بھر پیدا ہو جو کسی اور نے اپنے کردار سے پیدا کیا تھا یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ وہ جو کجی روٹی کھاتے تھے اور حقیقت میں بھی ان کے ہاں گوشت نہیں ہوتا تھا اور کچا اینٹ تو کیا کچی اینٹ کا مکان بھی نہیں بنایا اور مکان کی چھت اتنی پستی تھی کہ ہاتھ لگ سکتا تھا۔ جو چیزیں قرآن مجید نے جائز کی ہیں انہیں ان مثالوں سے کیوں غیر مستحب کرتے ہو قرآن کی تعلیم یہی ہے کہ دنیا کی اچھی چیزوں کے لیے نیچے دیکھا کرو اور آخرت کی بھی اچھی چیزیں مانگو۔ "ربنا انصافی اللہ دنیا حسنہ والی الاخرہ حسنہ" یہ البتہ آپ بلند آواز سے کہیں کہ وہ دنیا میں رہ کر تجارت کرتے ہوئے دنیا والوں کا کیریکٹر اپنی مثال میں سے بنا رہے۔ ایک مثال اور دیانت کی جس کی وجہ سے وہ امتین کہلائے۔ ایک ان کے پاس ذاتی امانت تھی جو آپ کے پاس بھی ہے اور آج بھی اس امانت پر پڑا وہ زور دینا چاہتا ہوں۔ کوئی کہتا ہے کہ کبھی امانت تھی جس کو آسان دین نہیں اٹھا سکتے تھے۔ "ولمصلح الانسان" مگر انسان نے اپنے ذمہ لے لی۔ اور یہ امانت مصلح کی

د " حق میں رہیں گے

اقبال کے عشق کے ہم دونوں کے بل نکال دیے اور ایک حب علی میں جلتا ہوا تو دوسرا بغض معاویہ میں۔ یہ پڑھیں کہ کون کس میں مگر خدا جانے وہ بڑائی جس کے لیے ہم لڑ رہے تھے آج کل کہاں ہے۔ ہم یقیناً ساتھ تو نہیں لائے نہ ساتھ لے جائیں گے۔ تو میرے دوست اگرچہ آج میں چوہری نذر احمد خاں کی عدم موجودگی میں عید میاں دھنارہا ہوں مجھے یقین ہے کہ یہ باتیں سن کر ان کی روح خوش ہوگی وہ جہاں بھی ہوں خدا کرے ابھی سو سنا کی میں ہوں اور اس بات کا انکار کریں کہ مجھ پر کوئی فتویٰ صادر ہو۔ مگر مجھے فتویٰ سے زیادہ اس بات کا ہے کہ پھر کوئی ان سے یہ نہ کہہ دے کہ کھینے صاحب! کیا نیات صاحب کو اور جو کچھ کہنا تھا کہہ دیتے وہ تو نہیں مغرب کی طرح عادت سے مجبور ہیں اور بغض مغرب کا پاکستانی نام اب کیا نیات ہے۔ مگر آپ کی مقدس روح کو حق میں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ دو سال پہلے وہ کہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب میں نے ان کے بارے میں مرحوم کا لفظ استعمال کیا تھا کیونکہ ان دنوں وہ تازہ و تازہ انارنی جزل ہوئے تھے آپ بھی سن کر خوش ہوئے تھے اور میں تو خوشی سے زیادہ خوش تھی میں جتنا رہتا ہوں۔ ایک ماہ بعد لاہور میں انہوں نے قصہ نہایت ایک گھنٹہ میں ان سے پوچھا کہ کیا انہیں معلوم ہے کہ میں نے ان کا ذکر کرتے ہوئے انہیں چوہری نذر احمد خاں مرحوم کہا ہے۔ انہوں نے جواب دیا "ہاں مجھے معلوم ہے میں خود بھی وہاں موجود تھا۔ میں خود وہاں تھیں سن کر بہت خوش ہوا تھا۔" اللہ آپ پر بھی رحم کرے۔" اعتراض کنندہ نے بات بناتے ہوئے کہا "شاید آپ نے ان کی تقریر غور سے نہ سنی ہو۔"

تو اسے وہ لوگوں پر ایمان نہیں لائے! غور سے سنو کیونکہ میں نے یہ تقریر لکھتے وقت محنت سے کام لیا ہے۔ محنت اس طرح سے کہ جب میرے پریشان افکار نکھرے ہیں تو دور دور تک پھیل جاتے ہیں۔ مجھ کو اس کا پتہ نہیں چلتا کہ ان کے رتے میں کسی وادی نمل سے گزرتے ہوئے کتنی چیز چٹاں پریشان ہوئی ہوں گی۔ یہ کہنا تو شاید نہاں ہو کہ "یہاں نمل اور طوطا سنگم" اسے وادی نمل کے رہنے والوں اعلیٰ ہوا اپنے گھر میں کیونکہ "افکار پریشان" کے سیدان شہر و طوطاں چیتوں کو روندتے چلے آ رہے ہیں۔ دراصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔ میں ایک پریشان خیال کو بڑی مشکل سے گرفتار کر کے لفظوں کا جامہ پہناتا ہوں پھر کاٹ دیتا ہوں اس لئے کہ یہ کپڑے دھونے کے مصطفیٰ ہے اور کوئی دھوینا ناراض ہو جائے گی۔ پھر کچھ اور کٹھ کاٹ دیتا ہوں کیونکہ یہ جامت کے مصطفیٰ ہے اور دھونے کے کسی گھنے یا پانی کی ناراضی کا باعث بن جائے۔ ایک صاحب نے دو مٹھے حریف کے لکھ کر میری توجہ خاص طور پر اس طرف مبذول کرانی کہ شہری تو سمجھ دار ہوتے ہیں مگر دیہات تکلیف کر میری باتیں کچھ نہ کچھ نہ جاتی ہیں اور اس طرح بیکار

کوئی پہنچے تو فرشتہ رحمت کہلاتا ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ اب میری موٹر کی ضرورت نہیں رہی تو میں بھی موٹر پیش کرنے پر تیار ہو گیا۔ زیادہ تر وہ ایک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ فرشتہ رحمت جنس شیر احمد ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ایک آدمی لیا ہے جو جتنا کا گھر جاتا ہے۔ جنس شیر احمد نے ان باتوں کا خیال نہیں کیا جو میرے ارادے کو کھڑ کر رہی تھیں۔ میں نے دل میں کہا آپ مجھ سے بہت اونچے ہیں۔ خدا آپ کو جنس شیر احمد خاں کر دے ایک پٹھان کسی کو اس سے زیادہ اور کیا عداوت سے سکتا ہے۔ وہ خان کے بغیر انسان کی شخصیت کو باکمل سمجھتا ہے اور شخصیت کو سوار بنا تصور وہ تو ایک خان نام کے شروع میں بھی لگا دیتا ہے مثلاً جنس خان شیر احمد خاں۔ مجھے امید ہے کہ میری دعا جلد قبول ہو جائے گی۔ خیر چھوڑے اس قصے کو۔ جو بات میں واضح کرنا چاہتا تھا کہ وہ جی کہ میرا عمل یہ وضو ہے یعنی میرے ارادے کی کمزوری اس کی تکمیل میں حاصل تھی۔ شیر جیسے لوگ ہمیشہ باخبر رہتے ہیں۔ ایک وفد ایک چھوٹی سی بات پر ہماری لڑائی ہو گئی۔ وہ کہتے تھے کہ ایڈوائس جزل بڑا ہوتا ہے۔ میں کہتا تھا کہ لیگل ری ممبر خضر (LAGAL REMEMBRANCER) بڑا ہوتا ہے۔ معاملہ دیر پاغلی نہ پھلے۔ انہوں نے دونوں کو بلا دیا۔ غالباً یہ بتانے کے لئے کہ تم دونوں سے بڑا میں ہوں۔ مگر شیر نے ان کو یہ موقع نصیب نہیں ہونے دیا۔ جیسی سے دس منٹ پہلے اس نے مجھے دونوں کندھوں سے پکڑ لیا اور کہا کہ میں یہ جھگڑا نہیں ختم کروں گا۔ آپ نے ان کی تصویر دیکھی ہو تو یاد ہوگا کہ جج جعفر کی طرح چوڑا اور بارہب چہرہ ہے۔ اندھ میرے میں شاید وہیت ڈاک بھی ہو کر اس کے جسم سے خوب بھر جاتی ہے۔ میں نے اپنے کندھوں سے دریافت کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آپ میرے کندھے بھی غلط کریں۔ کندھوں نے کھدے بغلیں کی زبان میں کہا۔

"ان الملوک اذا دخلوا القریۃ الفسداھا"

جب بادشاہ کسی ملک پر چڑھائی کرتے ہیں تو اسے اماراں لے کر دیتے ہیں۔ جب کسی کو کندھوں سے پکڑتے ہیں تو ان کو برابر کر دیتے ہیں۔ میں چیف منسٹر کے رے کی طرف حسرت سے دیکھنے لگا۔ شیر نے کہا "نہیں۔" وہ کرنا بھی دور ہے۔ میں نہیں پر جھگڑا ختم کئے دیتا ہوں میں نے سوچ لیا ہے اور فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ بڑے ہیں۔ "میں نے یہ سنا تو خوشی سے میری ہانچیں کھلی ہوں یا نہ کندھے ضرور کھل گئے۔ میں نے خوشی اور فیاضی سے کہا "نہیں۔" آپ بڑے ہیں۔ "اس نے کہا "نہیں۔" آپ بڑے ہیں۔ "میں نے کہا "پہلے آپ۔" اس پر ایک اور جھگڑا اٹھ اٹھا۔ اور آخر یہ فیصلہ ہوا کہ کم دونوں بڑے ہیں۔ چندے آقا بہت اب۔ میں نے بہت بڑا پند کیا۔ کیونکہ سورج تو اس وقت چمکتا ہے کہ وہ دن کی روشنی دیتا میں کھلی ہوئی ہوتی ہے اور چاند اندھ میرے میں چمکتا ہے۔ اللہ نہ وہ دایہ و کیٹ جزل رہے نہ میں لیگل ری ممبر خضر

د " حسن میں رہیں گے شوبیاں

عاشقی قید شریعت میں جو آ جاتی ہے

تعلیم اسلام کالج ربوہ

ماثقی قید شریعت میں جو آ جاتی ہے
جلو سکرٹ اولاد وکما جاتی ہے

آپ نے میرے مسلسل افکار کے باوجود جس زبردستی سے مجھ سے یہاں آنے کا وعدہ لیا تھا اس کے خوش فہم میں فخر ہے تو عاجز ہوں اور یوں بھی ایسے موقعوں پر فخر ہے ادا کرنا ایک دہی بدی ہو گیا ہے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ان بر خورداروں کو جو قومی زندگی کی دلیلیں ہیں کون سی کام کی بات سنا سکتا ہوں۔ علی بابا اور چالیس چور کی کہانی یاد آتا ہے امیر حمزہ۔ یہ تو پہلے ہی سن چکے ہوں گے۔ یہ کہنا بھی بیکار ہے کہ آپ قوم کا پیش ہمارا یہ ہیں کیونکہ یہ بات تو وہ پشت در پشت سنتے چلے آئے ہیں۔ یہ بھی سنا ہوگا کہ آپ کو قومی زندگی کی بڑی بڑی ذمہ داریاں افغانی پڑیں گی۔ ابھی توڑے دن ہونے کسی بزرگ نے طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ محنت کرو انعام لو۔ محنت کرو اگر کام لو۔ ہم تو افکار دیکھنے کام کرتے ہیں آپ آٹھ گھنٹے کی کریں۔ کیونکہ آپ ہم سے زیادہ جوان ہیں۔

اب سب باتوں کے بعد اتنا ہی کہنا رہ گیا ہے کہ قوم کا پیش ہمارا یہ ہونے کے باوجود آپ سب کے سب گورنر یا وزیر یا چیئرمین بن سکیں گے (جنوں کو کسر قسسی سے شامل کرتا ہوں) ہر چند کہ تقسیم ہند کے بعد ان مہدوں کے لیے جلد جلد باری آتی رہی ہے۔ پھر بھی آپ میں سے بہت سے معمولی مہدوں کے حامل ہوں گے اور اس لیے یہ کہنا ضروری ہے کہ ”گر بہت بڑی پستی نہ گردی مروی“

یعنی فرعی آئے اور پھر بھی طبیعت میں بستی نہ پیدا ہو تب صاحب کردار کہلانے کا مستحق ہے یا اگر خدا زندگی میں دولت و ثروت عطا کرے بھی اور قوم مست نہ ہو تب صحیح معنوں میں مرو ہے۔ ”گر بہ دولت بڑی مست گردی مروی“

آپ سے ہمیشہ یہ کہا جاتا ہے کہ ”محنت کرو“ ”محنت کرو“ ”محنت کرو“ لیکن یہ سن کر آپ پر ہراس کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اس لیے

خدا فیماں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ پہلے تو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں ان پریشانوں میں دیکھا فوٹا جھٹلا ہوتا رہا ہوں۔ دوسرے یہ کہ اگر کچھ کہنا ہی ہے تو اس طریقے سے کہوں جس طرح اور لوگ کہا کرتے ہیں یعنی سہان اللہ اکبر لوگ تھے۔ رات کو نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ دن کو آنا گوندتے تھے اور کپڑے بھی خود دھوتے تھے اور بیوی ابھی اتنی جھنجھی کہ وہ غلیظ وقت کے پاس بھی شکایت لے کر بھی نہیں گئی کہ یا مجھے طلاق دلو اور یا حقوق زن دلو۔ غالباً میرے نام لگا کر یہ باتیں سن کر جنس سہانے ایک مرد پر یہ بھی جوڑ کیا ہے ”کچھ نہ بگھے خدا کرے کوئی۔“

مکلی بات کا تو میں کیا جواب دوں۔ مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے کہ میری ذہنی ضرورتوں کو بعض لوگ اپنی ذہانت کے پیمانے سے کیوں نہ مانتے ہیں۔ دوسری بات جو انہوں نے طرز انہماک کے بارے میں کہی ہے اس کی تعمیل میں میں نے حتی التوابع کوشش کی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس مضمون کا اصل مسودہ صبح اور ترمیم کے نشتر سے زخمی پڑا ہے۔ چند و ظم شدید ہیں اور ایک سوچو وہ خلیفہ۔ اس میں تو آیات ہیں اور باقی روایات۔ اس کے لکھنے میں دس دن لگے ہیں۔ اور افکار دینے کے ویسے ہی پریشان ہیں ابھی تو میں نے وہ مرثیہ پڑھا جس میں قوم کے نام خطاب ہے مگر صاحب کے اس مرثیے پر مجھے انتہا بات کے زمانے کا ایک قصہ یاد آ گیا۔ دوٹ ایک امیدوار کے ساتھ زیادہ دیر کے بعد دوسرے امیدوار کے ساتھ زیادہ قحی۔ انتخاب کی انگریزی ایک امیدوار کر رہا تھا۔ آرزو امیدوار نے اس وصاف نامی پر تحصیلدار سے شکایت کی۔ تحصیلدار نے کہا اپنی کشتی کے پاس شکایت کرو۔ امیدوار نے کہا شکایت کی ہے مگر کچھ نہیں ہوا۔ تحصیلدار نے کہا بیچیف منسٹر کے پاس شکایت کرو۔ امیدوار نے کہا ہوں مگر کچھ نہیں بنا۔ تحصیلدار نے کہا تو کیا اتنے لوگوں میں ایک میں ہی آپ کو بد بخت دار نظر آتا ہوں؟ میں نے آخر کیا قصور کیا ہے؟

اور میں نے کیا قصور کیا ہے؟



میں غم اہل دل کے طور پر یہ کہوں گا کہ کچھ کم کیا بھی کر دتا کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکو اور شاید کھینچتے کھینچتے یہ احساس پیدا ہو کر دنیا تو کھیل کود سے بڑا کام بھی کریں کیونکہ والدہ بر گوار نے اگر کوئی جائداد چھوڑی تھی تو اس کے آٹھ دس بچے اور بھی ہیں۔ اس سوال سے تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا کہ ان کو کیوں اپنے گھر میں ایک فٹ بال ٹیم کی ضرورت پڑی اور کس لئے اس ٹیم میں ہر تین سال گزارنے کے بعد دو سو پچاس لاکھ لاکھ اضافہ ہو جاتا ہے۔ تمہاری والدہ کی صحت؟ بیٹا عورتوں کی صحت اس طرح اچھی رہتی ہے اور جب چار پانچ بچوں کے بعد ان کی جوانی بڑھ چاہے کی تھوڑی ہو جاتی ہے اور والدہ بر گوار خود بلا شرکت غیر سے جوان رہتے ہیں تو مجبوراً اور شادی کرنی پڑتی ہے تاکہ تعداد اور درجنوں میں اضافہ ہو۔

مگر اب تو اباجان کو گھیر دینے سے کچھ فائدہ نہیں۔ اس لئے آپ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں۔ ویسے بھی اپنے پاؤں ہیں اور ابھی تمہارے بھائی بیکھا رہے ہوں گے جو نا بلتے ہیں اور اپنے پاؤں پر نہیں کھڑے ہو سکتے اور تمہارا آخری بھائی جب پیدا ہوا تو اباجان ساڑھے اسی اکیس سال کے تھے۔ اس وقت تو خطیہ جالہ حرمی کے ساتھ "ابھی تو میں جوان ہوں" پڑھتے ہوں گے یہ خیال بھی نہیں ہوگا کہ ساڑھے تین سال کے بعد سرکار انیس یو جی حاکم اردو سے کی اور یہ بچہ کیا "اس درجن میں سے چار پانچ اور ابھی نا بلتے ہوں گے۔ اس لئے میں نے دیکھا ہے کہ پچھلے دو تین بچوں کو تو ابھی طرح تعلیم دیتے ہیں مگر بعد میں مال استعداد کم ہونے پر قرآن شریف کی ان آیات کا سہارا لیتے ہیں جو اللہ کے رزاق ہونے کے حقیق ہیں۔ یہ بھولتے ہیں کہ اللہ نے دنیا کو عالم اسباب بنا دیا ہے اور آپ کو بار بار کہا ہے کہ زمین و آسمان کی پیداوار میں اور بارش کے زمین پر پڑنے میں اور اس کی وجہ سے سبز سے کی روئیدگی کی مثل نمایاں پیدا کی ہیں ان پر غور کرو۔ لاشائیاں تو یہ لوگ ڈھونڈتے ہیں۔ مگر اور طرح سے۔ یعنی یہ بچہ نہیں سننے گا یا نہیں۔ اور اگر یہ نہیں سننے کا تو ممکن ہے اگلا یہ نہیں ہو۔ اس لئے جب تک پولین نہ آئے رو دھنل رہتا چلا جائے گا۔ مگر یہ نہیں سوچتے کہ پولین رو دھنل پر ہی کافی قحط ہو گیا تھا اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ پولین آپ کی گھر میں پیدا ہو؟

اتنا گھور گھر تھوڑا شیر احمد کے خوبصورت مضمون خاندانی منصوبہ بندی کا خیال آیا۔ انہوں نے یہ مضمون بڑی کاوش سے لکھا ہے اور کم از کم مجھے اس کے پڑھنے سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ بڑھکتہ نسل کے حقیقی میری معلومات کبھی صدی ابھی تک کافی تھی گی ہیں۔ صاحبان ایش تھانہ حرم میں نہیں پڑتا البتہ بعض ممالکوں کی طرح کہا کرتا ہوں "آپ بچہ فرماتے ہیں مگر....." اور کبھی کبھی اس گھر سے ایک ہزار گھر پھل آتا ہے یعنی "ملا دھالہ مضمون مھر" کو بھی بچے کے نسل میں رہنے اور دودھ پینے کا زمانہ قدرتی طور پر نہیں مینے ہونا چاہیے۔ اب آپ نو مینے اور دس دن کا حصہ تو بدل نہیں سکتے۔ دوسرا حصہ ایک سال آٹھ مینے رہ گیا۔ یہ تو مجھے کم

بھری COMPULSORY یعنی لازمی ہوتا ہے کہ یہاں تک کہ اس کا نام کی جائے یعنی یہ کہنا جب ہوگا کہ ایک سال آٹھ مینے نسلوں ہائز اس کے بعد نا ہو۔

یہ مسئلہ نے مضمون میں چھیڑا اور میں نے یہاں تک کہ اس کے بیان مسائل میں سے ہیں جن کے کالج کے طلباء کو جلد دو چار نہیں ہونا پڑتا جس طرح ہماری زندگی کے بعد ایک بڑی چیز آنے والی ہے جسے آخرت کہتے ہیں اسی طرح زندگی کے اندر بھی ہر چھوٹے معاملے کے لیے آخرت مقرر ہے۔ مثلاً بڑھاپے کے بعد اساتذہ اور اس کے شاگرد کبھی روٹی کھانے سے پیٹتہ دور۔ اگر اس چھوٹی آخرت کی خبر جو شادی کے نتیجے میں واقع ہوتی ہے آپ کو ابھی سے دی جائے تو آپ کو اس پر غور کرنے کا موقع مل جائے گا اور آپ اپنے حالات کے مطابق ازدواجی زندگی کی تشکیل کر سکیں گے ورنہ جب تک آپ کو یہ پتہ چلے کہ کیا ہوا تو مصداق "جہنم واکر دو جہان دگر سے پیدا شد"

آٹھ کھولیں گے تو ایک نئی دنیا آپ کو اپنے گرد کھینچی نظر آئے گی۔ پھر کوئی خاتون مسلم ایک طرف سے "کوئی سوشل ویلفیئر کا سہارا لے کر" ٹیلیفون کریں گی کہ کھانا کی تہہ ملی اگر قصور یا غداروں کی ذمہ داری تو نمونہ ہوں گی۔ جب ان سے کہا جائے کہ عموماً نئے افراد کو چھوٹی جگہ بھیجا جاتا ہے کیونکہ ان کے گھر بے چراغ ہوتے ہیں۔ تو خاتون فرماتی ہیں کہ یہاں تو اب چراغ موجود ہے جس سے کئی چراغ روشن ہو چکے ہیں اور مزید چراغوں کے روشن ہونے کی امید ہے کیونکہ صورت میں باہر نا مشکل ہوگا۔ ایک دفعہ تو مجھے کہنا پڑا کہ کم سے کم صرف خاندان کو ملازمت میں لایا ہے۔

بہر حال اس مسئلہ کو کئی مہینوں یا ضروری میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کے ادارے کی چار پانچ بیویوں تک محدود ہو بلکہ سب کھانا کریں۔ چھین جائے کہ اگر آپ نے جسنی اور ذلیل کو تہہ کا ایک ضروری حصہ دیا تو بعد میں کچھت میں گے۔ یہ جو صحیح منج لوگ سڑکوں پر بھاگے بھرتے ہیں یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ سکول اور کالج کے زمانے میں مرزا پھو یا سنے رہے۔ مرزا پھو یا پرانے علی گڑھ کا ایک کردار ہے بلکہ اس کی یادگار ہے۔ وہ گھر میں بڑے بڑے سے پلا تھا۔ اپنے چاروں طرف اس نے خزاں کا ماحول قائم کر لیا تھا۔ کالج تک پہنچنے پہنچنے پر اچھا خاصا ساڑ اور غز وین کیا تھا۔ گھر بڑا کھلتا تھا "کالج میں کوئی مائٹیں کر میں روغن بادام ملے۔ چار پانی سخت ہے تو سسکے تو کھرے اور جھگوا دو۔ کرسی کی سیٹ بھی لکڑی کی ہے ملوہ مفر کھٹکے فتم ہو رہا ہے۔ مجھے نہیں آتا کہ اس کے بغیر لکڑا کس جبر سے پڑھا گا۔" اللہ کا نام مرزا پھو یا پھو یا پھو ہو گیا۔ وہ لڑکا بھی ایک قسم کا مرزا پھو یا ہے جو روز میں نہیں کرتا اور شام کو گھسیں کپڑے مابن کر بال بنا کر لکھا ہے اور زمین پر نرم نرم قدم رکھتا ہے تاکہ زمین کو دکھ نہ ہو۔ یہ اگر دنیا میں کامیاب بھی ہو

جس اگر منصف نازک کے اوصاف کی تصویر بھی کھوڑے کے اوصاف سے دی جاتی ہے تو کھوڑا اچھا ہی جانور ہوگا۔ درنہ شر فرود اور خرد ماغ جیسے لفظ بھی تو رائج ہیں۔

یہ سارے شر فرودے اسطیل کے ذکر سے پیدا ہوئے جس اسطیل سے آپ کی ابتدا ہوئی ہے اس کو نہ جو لیے گا۔ مجھے عرب کا ایک پراٹا قصہ یاد آیا غالباً خلفائے راشدین کے زمانے کا ذکر ہے کہ عرب کے ایک سفر کے متعلق جو غیر ملک میں تھا غلیظہ کو حکایت پہنچی کریشان و شکرت کی زندگی بسر رہا ہے۔ لباس حریر پہنتا ہے۔ غلیظہ نے ایک خاص آدمی اور بیات کے لئے کھانا تو اس نے دیکھا کہ واقعی ابرہہ کی تھا اور ہے۔ اسلئے نے اپنے آنے کا مدعا بتایا تو سفر نے ابرہہ کی قبا کا ایک گوشہ اٹھا کر دکھایا کہ وہ نیچے گدڑی پہنے ہوئے ہے اور یوں تشریح کی کہ میری عادت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صرف اس خیال سے رہنمائی پہنچے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ یہاں کے درباری یہ نہیں کہ عرب کے دروازے خرقہ پوش جاہل ہیں۔

ممکن ہے یہ قصہ کھلی حیثیت رکھتا ہو۔ بہر حال میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ آپ بظان کے نیچے بھی ڈھائی گز کی چادر باندھا کریں۔ آپ کا دل خرقہ پوش ہے تو کافی ہے اور یہ خرقہ پوش بڑے ہمدوں میں نہایت بخشنے ہے چھوٹے ہمدے تو خود خرقہ پوش ہیں۔

کالج کے زمانے کو آپ ایک متقل صدوق کی طرح آئندہ زندگی سے علیحدہ نہیں رکھ سکتے کیونکہ جو عادتیں آپ یہاں بنا گئیں گے وہ مستقبل میں آپ سے علیحدہ نہیں ہوں گی۔ یہ برائی پہاڑوں کی عادی جو آپ کے بیچ سے جاری ہے آپ کے ساتھ ریت کے ٹیلوں میں بھی جاری رہے گی۔ یہ غلط ہے کہ اچھا کار باہل گیا تو عادتیں خود بخود داغی ہو جائیں گی۔ ان ضرورتوں کہوں گا کہ آپ کے صیب دولت میں چھپ جائیں گے۔ چنانچہ ایک بزرگ نے کہا کہ دولت خدا تو نہیں مگر وہ خدا اور خدا کی طرح سارا صیب اور ارضی الحاحات ہے۔ اور زندگی میں بیشتر حصان لوگوں کا ہے جو اس طرح ظاہر خوش خرامی کے ساتھ صبح کرتے ہیں شام کرتے ہیں اور عربی قیام کرتے ہیں مگر چند ایک ایسے ہوتے ہیں جن کی پیشانی آپ لوگ پہچان لیتے ہیں۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان پیشانیوں میں آپ کو کیا نظر آتا ہے مگر انہیں دیکھ کر آپ کے دلوں میں ایک تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی تعداد میں آپ اضافہ کریں۔ ان پیشانیوں کی تعداد میں اللہ تعالیٰ نے جمہوریت کا اصول نہیں رکھا ہے۔ نہ وہ کہوں کہ مفرے ایک انسان بنا ہے نہ وہ ہزار خوش خراموں کے صبح شام کرنے سے ایک اٹل نظر پیدا ہوتا ہے۔ میں نے غلط کہا کہ اس جگہ جمہوریت کا اصول نہیں رکھا۔ میرا مطلب مساوات کے اصول سے تھا۔ جمہوریت تو اس طرح پر ہوتی کہ وہ ہزار خوش خرام جب ایک آدمی کو پیشانی سے پہچان

جائے تو اپنے ہی لئے کامیاب ہوگا۔ زندگی میں نہ نرم قدم رکھے گا۔ آہستہ آرام بلکہ حرام۔ آہستہ قدم رکھو بلکہ قدم ہی نہ رکھو پاکی میں بیخود۔ یہ پاکی میں بیٹھے والے چیزوں کی ہاگ ڈور نہیں سمجھا سکتے کیونکہ پاکی کی ہاگ ڈور نہیں ہوتی۔ اس کو اور لوگ چلاتے ہیں۔ آپ مرزا پھو یا بننے سے گریز کریں۔

وہ جسے تعلیم الاسلام کالج کی خدا میں مرزا پھو یا بننے کی زیادہ گھماکتیں نظر نہیں آتی۔ مرزا ناصر احمد نے اپنے ”مختصر تعارف“ میں جو کہا کہ ”گو 1947ء کے بعد اس کالج کی ابتدا ایک ڈیری فارم کی عمارت سے ہوئی تھی جس کا چھلا حصہ ایک اسطیل کا سارا رنگ رکھتا تھا تاہم اس وقت کے لئے غلطاً نے منتہای شہدہ پیشانی کے ساتھ کہیں۔“ اس سے مجھے یقینان ہوا اور اگرچہ وہ غلطاً باب چلے گئے ہیں آپ ان کی روایات سامنے رکھ کر چلیں۔ آپ اب بھی اس ڈیری فارم کا تصور دل میں رکھیں جو محض اس لئے چلایا جاتا ہے کہ دیگر لوگوں کے لئے مفید چیزیں دودھ اور مکھن کی قسم کی چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔ آپ اپنی ذات کے علاوہ دیگر لوگوں کے لئے مفید بننے کی کوشش کریں۔ اسطیل کا تصور بھی اچھا۔ لوگ اسطیل کے ذکر سے گوبر کا بھی خیال کر سکتے ہیں اور گھوڑوں کا بھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ مکان نہیں اسطیل ہے۔ لوگ کسی چیز کا برا بھلا زیادہ دیکھتے ہیں۔ ہر شخص کی فکر اس کی امت کے برابر ہوتی ہے۔ اگر گھوڑا اچھا جانور نہ ہوتا تو زبان میں گھوڑوں سے متعلق محاورے حسن کردار کے معنوں میں نہ استعمال ہوتے۔ گوئے و چکان کا تصور بغیر کھوڑے کے مشکل ہے۔ اس بات کی مثال سے سعدی نے یہ واضح کیا ہے کہ اگر اچھی نسل کی چیز کمزور بھی ہو تو بری نسل کی چیز سے اچھی ہوتی ہے۔

اسپ تازی اگر نصیحت یوز
بچان بڑا طویلہ خرپ

اور گدے کو خود بھی یہ احساس ہے کہ گھوڑا مجھ سے بڑھ ہے۔ بغیر دودھ کے حاصل پر ایک دن ایک گدے کی ملاقات ایک غورڈ گاڑی سے ہوئی۔ یہ پرانی غورڈ گاڑی ہے جو اس وقت موٹروں میں ناقص تصویر کی جاتی تھی۔ گدے نے غورڈ سے پوچھا آپ کون ہیں؟ غورڈ نے کہا ”میں موٹر کار ہوں۔“ گدہ حاش کر بولا ”میں گھوڑا ہوں۔“

اسی طرح سب رفتار کا لفظ اور مسند ناز کا مقام تو خاصا اونچا ہے۔ ناز کہہ کر شہر کو مسند ناز سے تصویر دے کر اسے ناز ناز لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں ”مسند ناز پر ایک اونٹ ناز یا نہ ہوا“

میں برہمنوں کی جیت پر عس کی دند دند دلاں نہ آپ گور ارمیدہ اہ

ان کے دل دریا جیسے ہوں جس میں موتی کا پانی بہتا ہوا اور ہر ٹکے کے کرنے سے ان کی پیشانی پر ہل نہ پڑیں۔ ایسے لوگ صرف تعلیم الاسلام کا لچ کے نہیں بلکہ پاکستان کے ہیں۔ صرف پاکستان کے نہیں بلکہ دنیا کے ہیں اور اس لئے میں یہ دیکھ کر زیادہ خوش ہوا ہوں کہ اس کا لچ میں قریباً 45 فیصد طلباء اس گروہ کے نہیں ہیں جس کا روبرو سے خاص تعلق ہے۔ میں اس گروہ کا جذبہ جاننا دیکھ کر قریب کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آپ کے گزشتہ تین گیم نیورٹی کی اوسط سے بھر ہیں۔ مگر میں محض سالانہ نتائج پر نہیں سال کا نتیجہ دیکھنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ سنا ہے کہ آپ کا لچ کشتی رانی میں کئی سال سے نیورٹی میں اول آ رہا ہے۔ یہ کشتی رانی جاری رکھئے گا۔ جاری کشتی بھی بخیر کے قریب جالے گئی ہے، ابھی اس میں سوراخ ہو جاتا ہے اور کچھ نہیں تو اس کے پیچہ مرمت کے منتظر رہتے ہیں۔ جب آپ کی باری آئے تو اس طرح چلائیں جس طرح مشتاق کشتی ران چلایا کرتے ہیں۔



میں گے تو اس کی حمایت کریں گے اسی کو دہانت دیں گے۔ جب میں کہتا ہوں کہ ان کی تعداد میں آپ اضافہ کریں تو میرا اصل مدعا یہ ہے کہ بہت سی چیزوں کی نشوونما اس فضا سے ہوتی ہے جس میں وہ پہلے ہیں۔ اس کو آج کل اردو میں ماحول کہتے ہیں۔ میں لفظی سے بعض دفعہ ماحول کہہ رہا تھا۔ مجھے ماحول کا لفظ یاد نہیں ہوتا تھا ماحول سے کچھ معنی اور کچھ معنی مناسب نے یہ مشکل آسان کر دی کیونکہ بعض ماحول ایسے ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر ماحول پر مہنت پڑتا ہے جیسے طالب علموں کے لئے مرزا ناصراحمہ کے الفاظ میں ”اں ہور کی سوسم فضا“ جس کا ذکر ابھی انہوں نے اپنے مختصر تعارف میں کیا ہے اور جس کی وجہ سے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ اس کا لچ کولہاور سے یہاں منتقل کیا جائے اب ہمیں فضا انہوں نے اور ان کے خلاف نے یہاں بنائی ہے اس کا انحصار ان کی دور بینی اور داخل مندی پر ہے کیونکہ لڑکے تو گیلی لٹی کی طرح ہیں جیسے سانچے میں ان کو ڈھال دیا جائے وہیں شکل اختیار کر لیں گے۔ مگر میں نے ایک اینٹ بنانے والے سے ”جس کی انٹیں بد صورت ہوتی ہیں اور زیادہ موٹی ہیں سنا کہ یہ مٹی کا قصور ہے اس میں وہ پختہ ہوت نہیں جس سے قوام پیدا ہوتا ہے۔ میں نے کہا اس میں وہ چیز ڈالو جس سے پختہ ہوتی ہے۔ اس نے کہا وہ خود دیک سے دستا پ نہیں ہوتی اور چڑ زیادہ ہوتا ہے۔ میں مرزا ناصراحمہ سے امید رکھتا ہوں کہ بعض طالب علموں کی مٹی میں واجبی پختہ ہوت نہ پائیں تو اس کی کی محنت اور تربیت سے پوری کر لیں گے اور اپنے مناف کی بھی اس طرح تربیت کریں گے کہ وہ میرے اس پرانے استاد کی یاد نہ تازہ کر دیں جو کلاس میں اپنی مقدس جگہیں میرے رکھ لیا تھا اور جن ناگوں کو ہیڈ ماسٹر مکی خاموشی سے اندر آ کر میرے اٹھا کر بیٹھ کر دیتا تھا اور جب تک وہ اپنی ناگوں کی گنتی کرے کہ ٹھیک تعداد میں آتی ہیں یا نہیں ہیڈ ماسٹر اسی خاموشی کے ساتھ دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتا تھا۔ استاد مکی اب ناگہ پڑنا تک مجھے شامے ناگروں سے کہتے ”پڑھو۔ میں تو روزی حلال کرتی ہے۔ اور یہ ناگوں کو میرے بیٹھے دھرتا ناگوں ہی ہیڈ ماسٹر ہے۔“ ہمارے ملک کے شمال مغربی اطراف میں کسی چیز کو مانگنا ہوتا کہتے ہیں اس کو حلال کر۔ آپ سے استدعا ہے کہ استاد مکی کی طرح روزی حلال کر کے تعلیم و تربیت کو مانگ نہ کریں۔ بلکہ اس فضا کو فراغ کر دیں تاکہ ناگوں کے بیٹے مکمل جا سکیں اس طرح کی درس گاہوں پر بعض دفعہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ بے اعتباری کشائی ہیں۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ ”کریں گے اہل نظر تازہ ہمتیاں آ ہاڈ“

میرا مشورہ یہ ہے کہ اس اعتراض کو پیش نظر رکھ کر آپ اپنا پہلا اصول تعلیم یہ بتائیں کہ آپ کے طالب علموں میں احساس ہے گا لگی پیدا ہو۔ جب وہ اس حد تک کوچہ و گزندی میں قدم نہیں تو ناگوں کو محسوس ہو کہ یہ کسی خاص تربیت گاہ سے آئے ہیں۔ یہ جنات کش بھی ہیں یا ناگہ کار ہور رکھتے ہیں اور ان دونوں باتوں سے بڑھ کر یہ کہنگ دل نہیں ہیں۔

پہلے موقع مل چکا ہے کہ وہ اپنے کو ایک زندہ قوم بنائیں مگر جس طرح کسی کو شدت کی نیند آ رہی ہو اور وہ سارے کپڑے بدلنے کی بجائے صرف گلے کے قریب کاٹن کھول کر سوجاتا ہے تاکہ گھاس گھنے سے بچا رہے اور جو کچھ ہوتا ہے ہوتا رہے۔ اسی طرح مردوں نے اپنے نام کا ایک ذریعہ بدل دیا ہے اور زبردور ہو کر مردوں کی طرح پڑے رہے۔ ایک تنگ ان کو چند سال اور سات مہینے ہوئے ہیں۔ (1947ء سے آج تک) اور وہ کبھی کبھی ایک آنکھ کھول کر پڑے پڑے حالات کا جائزہ لے لیتے ہیں اور بھرپور کہہ کر کہ ہم تو صحابہ کف ہیں اور ابھی ہماری نیند کی میعاد نہیں گزری۔ وہ ایک آنکھ بھی بند کر لیتے ہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ آنکھ کھولتے کب ہیں۔ ایسا معطوم ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت کے بعد جیسے کوئی باقاعدہ ٹھکنی بھاتا ہو پانچ سال اور پانچ مہینے کے باقاعدہ وقفوں کے بعد انہوں نے دو دفعہ آنکھ کھولی۔ مگر ”چشمہ دار کردو جانے دگر سے پیدا شد“

آنکھ کھولی تو ایک نیا عالم تھا یعنی مارشل لا تھا۔ ان کی زندگی آنکھیں دو حالات پیدا کر دیتی ہیں کہ جن کو ملک یعنی برے اور اور بھلا یعنی پرہیزگار میں رک جاتے ہیں۔ اختلاف کیل دہنار نہیں رہتا۔ یعنی رات ہی رات رہ جاتی ہے اور دل و دماغ آئینہ و قانون سب کچھ معطل ہو جاتا ہے۔ باقاعدہ پانچ سال اور پانچ ماہ کے بعد۔ اگر کبھی چھ مہینے ہو گئے ہوں تو میرا قصور نہیں۔ ماہ رمضان کا قصور ہے جو کبھی اٹھائیس دن کا ہوتا ہے کبھی انیس دن کا۔ اور یہ محض ایک روایت ہے کہ کسی زمانے میں تیس دن کا بھی ہوا کرتا تھا۔ تیسواں دن ان کو عموماً دلوں میں چھپا رہتا ہے۔ اب یہ پانچ سال اور پانچ مہینے کا تیسرا وقفہ نومبر تا دسمبر 1967ء میں آئے گا۔ ٹھیک تاریخ کا مضمین کرنا مشکل ہے کیونکہ ایک تو جس چیز کو رویت ہال کہتے ہیں۔ وہ عیسائی دینی ہے دوسرے اس بات کا چند فیئیں کہ صحابہ کف اب کے عیسوی سال منا گئیں گے یا ہجری۔ قائد اعظم سوسائٹی کے نقطہ نگاہ سے دسمبر کا مہینہ بہتر ہو گا تا کہ عید ان کی روایتی برقرار رکھنے کے لئے کوئی اور ہنگامہ مقرر ہو۔ اب تو صرف خیرات ہی کرتے ہیں۔ شاید اس خیال سے کہ مہار قائد اعظم دوسری مرتبہ پیدا ہوں اور صحابہ کف کو اپنی بیٹی نیند سے جگا دیں یا اس شکرے میں کہ ان کی وفات ٹھیک وقت پر ہوئی اور وہ ہمیں ہماری طرح چکا کری چھوڑے اور ہماری نیند خراب کرتے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم جا گئیں۔ کیا ہم ہی جا گئے اور لوگ جا گئے کے لئے قصور ہے ہیں۔

حضرات! بہت سال ہوئے گو جہرا نولہ کے سیشن بیچ کے دفتر میں ایک کچھ نقل نوٹس تھا وہ کام نہیں کرتا تھا۔ میں نے اسے معطل کر دیا۔ ایک دن میں رہنا جنگ دم میں تھا کہ اٹھا کر سر بیٹھ نوٹس میں دھوئیں اور خیالات کے دائرے بنارہا تھا کہ نقل نوٹس بھاگا ہوا آیا اور میرے پاؤں پر پگڑی رکھ دی۔ ایک کچھ کے لئے پگڑی اتارنا اور اس گھس کے پاؤں پر رکھنا جو تھپا کو بی رہا ہو معمولی بات

اے اصحاب کف!

یوم پاکستان

حضرات!

آج میرا خطاب بالخصوص نوجوانان پاکستان اور نوجوانین پاکستان سے ہے اور اگرچہ ان الفاظ میں بلال پاکستان اور ستارہ پاکستان کی سرکاری زینت نہیں اگر کوئی اس ملک میں نوجوانان پاکستان اور خاتونان پاکستان کہانے کے قابل ہو تو اس سے زیادہ زینت کیا ہو سکتی ہے۔ اس سے بڑھ کر خطاب ”مردان پاکستان“ ہو سکتا ہے جو آپ کے محاورے میں نشان پاکستان کا مترادف بھی ہوتا اور ہم تاقیہ بھی۔ مگر مرد کا لفظ بہت عظمت والا ہے اور جب بھی اور جہاں بھی استعمال ہوا ہے شان کے ساتھ استعمال ہوا ہے مثلاً اقبال کا مرد مومن اور غلام کا مرد صدیقان۔ اور نہ صرف اس لیے میرا دل سے نکل کر مردوں کی طرف نہیں چلکا اس لیے بھی کہ اگر مردوں کو قبرستان میں مخاطب کیا جائے تو مخاطب کرنے والے کو پانچ گھبرا جائے۔ مردوں کو تو مخاطب اسی وقت کیا جاتا ہے جب ان سے کہنا ہو کہ تم یہ سلام ہو اور اس سے زیادہ ان سے کوئی بات کرتی ہو تو کبھی کبھی عجز یہ تہا رہی طرف آ رہے ہیں۔ اس لحاظ سے مرد سے اور جہاں لوگ ایک سٹل پر ہیں کیونکہ قرآن کریم میں لکھا ہے کہ جب جہلا کو مخاطب کیا جاتا ہے تو ان سے کہا جاتا ہے کہ تم پر سلام ہو۔ کبھی بھی اپنی قوم کی نیکی اور اپنی نیکی اکتا مطلوب کرتی ہے کہ ان افراد میں جن کو خدا نے بظاہر مرد پیدا کیا ہے مجھے زیادہ تر وہی مرد نظر آنے لگتے ہیں۔ ایک مردوں کا دوسرا جہاںوں کا۔ اور خوش قسمت میں وہ ہیں جو جہاںوں کی نیکی کی طرف تو مردوں سے ان کو ذرا کے مارے سلام کرتے ہیں۔ دوسرے ان کو خدا اپنے گرد و پیش کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ سوائے خوشحالی اور پھولوں کے باروں کے۔۔۔ اور کل بہشت بھی ہے۔

حضرات! مجھے مطلب کی بات کرنے سے پہلے چکر لگانے کی بری عادت ہے مگر راستہ پہاڑی ہے اور اوپر چڑھنے میں میرا سانس پھولنے لگتا ہے۔ یہ میری اپنی مرضی کی بات نہیں کیونکہ میں دم کا مریض ہوں جس کی طور بھی اور دیگر بھروسے بھی۔ آپ اگر اب تک مملکت قیاس میں ہیں تو کہے دیتا ہوں کہ میرا خطاب نوجوانوں اور عورتوں کی طرف اس لیے ہے کہ مردوں کو اس سے

میں سننے سے تو نہیں روکتا۔ بلکہ آپ کو یہ بات سنانے آیا ہوں کہ میرا دوسرا عین اور طرف ہے۔ کہیں میں نے پڑھا تھا کہ کسی شہری عورتوں نے اپنے سر میں دھن کی ٹانوی دیکھ کر ان کے پاس چوڑیاں بھیج دیں کہ آپ چوڑیاں پہنیں اور مردانہ کام ہم پر چھوڑ دیں۔ اگر اس تقریر کے ذریعہ کسی نے آپ کے پاس چوڑیاں بھیج دیں تو آپ میرے پاس بھیج دیں۔ میں پہنوں گا نہیں۔ یادگار کے طور پر رکھوں گا تاکہ آپ یہ نہ بھول جائیں کہ آپ کو وہ ٹانوا کیا بھیجی ہیں۔ "من تو کہ عورتوں میں حیرت ہے فسانہ کیا"

اور اگر چوڑیاں نہ دیتا تو اس سے بھی برا ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ آپ کو چوڑیوں کے لائق نہیں سمجھتی۔

اور اگر آپ میری بات نہیں سن رہے تو پھر میں آپ کو اس بیچ کا قصہ سناؤں گا جس نے دیکھ کر آپ کا ہاتھ پر لگا کر فریاد کیا ہے۔ اب میں صرف اس منٹ چھیں اور دوں گا۔ جب اس منٹ گزرے اور اس نے پڑانا بند کیا تو دوسری طرف کے دیکھ لے گا۔ "حضور یہ تو اب بھی بول رہا ہے۔" اس پر بیچ نے کہا "یہ بلا سے بول رہا ہے۔ میں سن ہی نہیں رہا۔"

میں نے عورتوں اور انوجوانوں کو اس لئے مخاطب کیا ہے کہ ان پر بات کا اثر جلدی ہوتا ہے اور وہ میری بات سمجھنے سے نہیں گھبراتے۔ جب تک میرے دوست مجھے سمجھتے ہیں تو ان کی بات میں بے دھڑک کہہ دیتی ہیں کہ ہمارے بچے تو آپ کی تقریر پڑھ کر جھنڈا ہاتھ میں لے لیتے ہیں لیکن میرے دوست یہ سن کر ادھر ادھر دھڑکتے ہیں کہ نہیں دیکھ اور روشنی کے بائبل نہ سن لیں۔ جو بات میں کہتا ہوں وہ مختصر ہے "فیض" اور یہاں اس نے لگا رہا ہوں کہ عورتوں کو پسند آئے۔ آپ ماشاء اللہ خود ہوشیار ہیں اور سمجھ گئے ہوں کہ آپ کی برائی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ عورتیں خوش ہوں اور یہ سمجھ کر ان کو مردوں پر ترجیح دینی گئی ہے وہ نہ زیادہ شوق سے مائل ہوں اور نہ پر وہ یہ کہتا چاہتا ہوں کہ آپ سے میں امتیاز ارجح ہوں جتنا ظاہر کر رہا ہوں۔ یہ پوچھیں عورتوں کی خاطر داری ہے اور پھر وہ بھی تو آپ ہی کی بی بی یاں نہیں اور لڑکیاں ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر آج کے بعد سو میں سے ایک بی بی بھی شام کو اپنے خاندان سے ملے پھرے کہ آپ نے آج پاکستان کے لیے کیا کیا تو میری محنت رائیگاں نہیں جائے گی کہ آپ پاکستان کے لیے کوئی تھک سکر کریں یا اپنی آدمی دولت ملک کے سپرد کر دیں۔ میں خود بھی کوشش میں ہوں کیونکہ غریب ہونا خداوند ایک گناہ ہے اور غریبوں کے متعلق خداوند سے بھی تو ملاحظہ ہوں۔ مثلاً غریب کی جو رو سب کی بھابھی۔ یہ بھی قیمت ہے اور پشتو میں کہتے ہیں کہ غریب کا مسئلہ بھی لوگ نہیں مانتے۔ اس لیے میری بات یا تو غریب ہونے کی کوشش نہ کرو۔ ہاں تو جب آپ سے بی بی ملے پھرے کہ آپ نے آج پاکستان کے لیے کیا کیا اور آپ یہ کہہ سکیں کہ جو کام میرے سپرد تھا وہ میں نے دیانت داری اور کوشش سے کیا ہے تو مجھ میں کہ آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

نہیں۔ اس وقت میں بھی کھانا کھا کر ایک آدھ گلوں بھاری ہی تھا اس لیے اس کے ہنسنے کی فراوانی سے بھاگ نہ سکا۔ اس نے کہا کہ مجھے معاف کر دو۔ میں نے کہا تم کام چھو نہیں کرتے۔ اس نے کہا کہ کام کرنے والے اور قہوڑے ہیں؟ میں نے پوچھا کہ تم کیا کرو گے۔ اس نے کہا کہ میں حضور کو دعائیں دیا کروں گا۔ بادشاہ وراثت آدھ۔ چانچیاں کو معاف کر دیا۔

صاحبان! جاننے والے اور قہوڑے ہیں؟ آپ سو رہے ہیں اور ابھی بھی ایک آنکھ کھول کر دیکھ لیا کریں کہ اگر آپ آدمی نہ چلتے تو خدا ضرور چلتا اور پھر جو کتنی ضرورت ہوتی۔

مگر اس کے نقل نویس کو بادشاہ نے کیوں معاف کر دیا؟ اس لیے نہیں کہ بادشاہت کی کمر میں بہہ گیا یا خوشامد کی لہر میں بہہ گیا بلکہ اس لئے کہ اس نے اپنی نا اہلیی کا اقرار کیا اور یہ کہہ کر میں تو کام اچھا کرتا ہوں نہ جانے آپ کو کیوں پسند نہیں اس نے اپنی نا اہلیی کو خیانت کا جواز نہیں دیتا اور نہ یہ پرانی عادت کہ مجھے سکھ ہونے کی وجہ سے تکلیف دی جارہی ہے حالانکہ ان دنوں یہ بہانہ ہر مذہب والے کو حاصل تھا۔ جب آپ کسی سے ملے پھرے کہ سردار مسکین حکم سے کیوں ناراض ہیں تو وہ جواب دیتا کہ اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا سو اسے اس بات کہ میں گھم دین ہوں۔ مگر اسے گھم دین اتنے بھی دین گھم بننے کی بھی کوشش کی اور اپنے اعمال کا جائزہ لیا۔ کبھی یہ بھی سوچا کہ ممکن ہے میں دیانت داری اور محنت سے کام نہیں کرتا ہوں۔ بہر حال ان دنوں صرف یہی بہانہ بصر تھا۔ اب اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں بصر ہو گئیں ہیں۔ "اس کے حاذق" اس نے کہا ہوں کہ اگر ہندو مسلمان "سکھ" سنی یا کھانا نہیں رہا تو سنی "شیعہ" احمدی یا دہرہ "عقیدہ" تھیرتھ "قرآن" ہندی "سہی" کو پانی "پٹاری" بلکہ میاں "میل" جنگل "فیل" (یہ کوہاٹ کے دو محلے ہیں) کا فرق یہاں پیدا کرنے کے لئے ہمیشہ میرے ہے۔ یہ تو ہوا کہ صاحب کا بہانہ اس کے علاوہ ابھی اور بہت سے بہانے بصر ہیں۔

اب اگر آپ نے کسی کے کام سے بیزار ہو کر اس کے متعلق لکھ دیا کہ اس نے منافائی کی شہادت لی ہی نہیں اور استغاثے کی شہادت مسل خواس سے لکھوائی ہے تو وہ کہتا ہے کہ منافائی کی شہادت کی لینا ہے اور مسل خواس ہوتے ہی کس لیے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میری ترقی کا مسئلہ درپیش تھا اور میرے خلاف ریمارک اس نے دیے تھے ہیں کہ مجھ سے اگلے آدمی کو ترقی مل جائے جس سے بیج صاحب کو خاس دیکھی ہے۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ بہانہ جو۔ مگر معاملہ اس وقت زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے جب آپ کو یہ معلوم ہو کہ واقعی کسی شخص کو اس نے خراب ریمارک دیے تھے ہیں کہ اگلے آدمی کو فائدہ ہو۔ یہ باتیں دیکھ کر دل آزرہ ہوتا ہے۔ اس کا تعلق اس وقت سے ہے جس کے لئے آپ نے پاکستان بنایا تھا تاکہ اپنے اختلافاتی تہذیب اپنے طریقے سے کر سکیں۔

اس آزرہ کی کہ عالم میں اگر میں آپ سے ناراض ہو کر انوجوانوں اور خواتین کو مخاطب کروں تو آپ ناراض نہ ہوں۔ آپ کو

نہیں چاہتا تھا۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ ایک خال ہندو کے بدلے دوسرے مل سکتے ہیں۔ چنانچہ اس شرعی تعمیر مارچ 1940ء کو ہوئی۔ مگر احتیاط کا پہلو نظر رکھتے ہوئے پاکستان ریزولوشن کے ہندی چہرے پر ایک کے بجائے دو خال لگائے گئے۔ یہ خال کیا لگے گا یا چار چاند لگے۔

مگر صرف ریزولوشن پاس کر لینے سے تو دنیا کا چہرہ بدل نہیں جاتا۔ اب اگر آل پاکستان قائدین باہاں ایسی ہی سہمن "جواب تک" وجود میں نہیں آئی ہے یہ ریزولوشن پاس کر کے کہ چانچل سوسے نہ زیادہ آدنی رکھنے والے ہمارے قائدین استعمال کریں تو اس ریزولوشن کا سب سے موثر حصہ ہوگا جس کی رو سے ایک ایک نقل ہریچنیکٹوری (برہمنچ بڑی) کے پاس بھیجی جائے گی۔ اب قائدین استعمال کرنے پر کسی کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ جب تک اس پر پیسے خرچ نہ ہوں۔ ہمیں تو اس پر بھی اعتراض نہیں کہ جب کوئی وزارت فتح ہو تو وزراء کے گھروں کے سرکاری قائدین لٹلی سے ہمارے گھروں میں آجائیں اور ہمارے کم قیمت قائدین ای لٹلی کے اجراء میں سرکار کے گھر بچھیں۔ پس محض ایک ریزولوشن کا پاس کرنا کچھ اہمیت نہیں رکھتا جب تک کوئی صاحب ارادہ کوئی عزم کا مالک نہیں پیدا ہوتا ہو جو اس میں مل کی روح چمک دے۔

ایک صاحب ارادہ تھا جس نے سات سال میں اس افسانے کو حقیقت بنا دیا وہ کیا بات تھی؟ سردار عبدالرب نشتر نے ایک دن بتایا کہ ایک دفعہ پٹوار کے ضلع میں ایک بہت بڑا جٹوں کا گھرانہ تھا۔ جس میں بڑے بڑے صاحبان ریش (ریشا لیل) اور باجی تھے اور قائد اعظم کو ساتھ لے جا رہے تھے۔ نشتر نے ان کو خوش کرنے کے لیے کہا یہ ملا لوگ کسی کی بھی قیادت نہیں مانتے اور خصوصاً انہوں کی جن کی ریش ہونہ بدروت نگر آپ کے سامنے اس سب نے تسلیم فرم کیا ہے۔ قائد اعظم نے جواب دیا "تم جانتے ہو؟ اس لیے کہ یہ لوگ جانتے ہیں کہ میں اپنے لیے کچھ نہیں کر رہا۔" یہ تو ممکن ہے کہ ایسے لوگ مل سکیں جو بے ریائی سے آپ کے لیے کام کریں مگر ان سے کام لینے کے لیے ایسا رہنما چاہئے جو اولواغلام ہو۔ اور اس لفظ میں قوت ارادی اس قدر بھری ہے کہ پیغمبروں میں بھی سب کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں ہوا۔ میں قائد اعظم کے لیے کوئی دعویٰ پیغمبری نہیں کرتا۔ اور نہ ہی اولواغلام صرف پیغمبروں کے لیے ضروری ہے۔ دنیا کے کام اس کے بغیر نہیں ہو سکتے اور جتنا بڑا ارادہ قائم کیا جائے اتنا بڑا کام ہو سکتا ہے۔ یہ ٹیک ہے کہ قوت ارادی بہت حد تک ایک خدا داد دولت ہے لیکن اس کا بڑھانا اس کا استعمال کرنا انسانوں سے تعلق رکھتا ہے مثلاً قائد اعظم اکیلے کیا کر سکتے تھے۔ اگر آپ ان کے پیچھے نہ ہوتے۔ آپ نے ان کے لیے یہ جمن کر دیا کہ وہ پاکستان کا مظلوم کریں۔ کیا یہ سب کچھ حاصل کر کے اب آپ ناقل ہو جائیں گے۔ جب تو آپ کی مثال اس شخص کی ہی ہوگی جس نے زمین کے حاصل کرنے کے لیے

مگر اسے صاحب کتب یا ڈاکٹر وودان جو 23 مارچ کا تھا۔ سن 1940ء میں اس شہر لاہور میں تم نے مسلم لیگ بن کر قائم اعظم کی سرپرستی میں پاکستان ریزولوشن پاس کیا تھا۔ اس سے پہلے "لم تکن ہینا دکھو" کی حیثیت رکھتے تھے یعنی قابل ذل و جہنم نہیں تھے اس سے پہلے پاکستان محض ایک خیال تھا اور جب اس قرارداد کی رو سے یہ ملے ہوا کہ اس مسلمان کا مصلع نظر اپنے لیے ایک طبع و ملکیت پیدا کرنا ہوگا تو اس کی تائید کرنے والے قیام پاکستان کو ایک کھلا امکان ہی بدیہی سمجھتے تھے۔ یہی خیال تھا کہ اگر ہم ملحد و ہونے کی دھمکی دیں تو شاید ہمیں مشرق ہندوستان میں زیادہ حقوق مل سکیں۔ میں خود وہاں موجود نہ تھا اس لیے اس بات کی ذمہ داری راوی پر ہے جو اس صورت میں راجہ غفر نگر خاں ہیں اور جو دہائیے راوی کی طرح رواں تھے سا پکارتے ہیں۔ ان کی روایت ہے کہ اصل قرارداد سر سکندر حیات کی تھی اور وہ یہ تھی کہ ہندوستان کے اندر دوسرے مسلمانوں کے ہوں گے جو امور خارجہ اور دفاع کی حد تک دوسرے صوبوں کے ساتھ اشتراک کریں گے۔ مگر قائد اعظم نے اس میں دو لفظ تبدیل کر دیے جس سے قرارداد کا چہرہ بدل گیا۔ چہرے پر تو صرف دو خال لگائے گئے۔ ایک جناب کی کشادہ چوٹی پر دوسرا بالکل کے چادر ڈھانچا پر نعرہ میں اپنی کشش پیدا ہو گئی کہ وہ دوسرے آزادی کے طالب ہوئے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ایران میں ایک شاعر تھا جس کا نام خواجه حافظ تھا اور اس نے خال ہندو کے بدلے سرقد اور بخارا کیٹھے کا وعدہ کیا تھا۔ "بخال ہندویش عظم سرقد و بخارا را"

شرط صرف اتنی تھی کہ کوئی ہمارے دل کا ہاتھ میں لے بہت آدول مارا یعنی محبت سے رام کر لے۔ لوگ سمجھے کہ یہ محض مجازی کی یاد گزاری ہے۔ مگر آپ نے یہ نہیں سنا کہ "دل بہت آدول کر کچھ آراستہ"

اس لیے دل کا ہاتھ میں لے لینا کوئی جبری کیفیت نہیں بلکہ ایک لفظی معراج ہے مگر حافظ بہت بات کو اپنے دھنچیلے طرز میں پیش کرتا ہے اور بدخواہوں نے جوور کے پاس جا کر اس کی عقلی کمائی کر دیکھنے ضرور آپ نے تو اتنی محنت سے سرقد و بخارا کیٹھے۔ یہ شخص ایک خال سیاہ کے بدلے انہیں مفت بخش رہا ہے۔ یہ عقلی کمانے والے برہمن ہیں اور حافظان عقیدہ ریش کے خلاف جوورائز مانتے کو اساتے رہے ہیں۔ خود تو سرقد و بخارا کیٹھے کر سکتے ہیں اور نہ بخش سکتے ہیں۔ اور لوگ بھی بخشش سے روکتے ہیں۔ اور بخشش بھی کس چیز کی؟ صرف ایک لکڑی آزادی جہول کی تاریک دیرانوں میں اچالا کر دے۔ اقصیٰ جوور نے ناراض ہو کر حافظ کو بلایا اور اس سے جواب طلب کیا (یعنی) EXPLANATION مانگا۔ اس نے زمانے میں بھی

EXPLANATION لیے جاتے تھے کہ تم کیوں ایسی غلطی کرتے ہو۔ اس نے جواب دیا۔ یہی غلطی اٹھائیں تو ہیں جنہوں نے مجھے اس حال تک پہنچایا ہے۔ بادشاہ راغوش آدھار دیکھا کہ میری حالت حافظ سے بہتر ہے مگر حافظ اصلی بات تو اسے بتانا

آپ کا کتا ہے، بعض کہتے ہیں کہ آپ پانچ ہیں اور چھنا آپ کا کتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ آپ سات ہیں اور آٹھواں آپ کا کتا ہے۔ اللہ ہی بیخبر جانتا ہے مگر کتا برحالت میں آپ کے ساتھ ہے اور اگرچہ کتا ایک وفادار جانور ہے اور آپ کو ان بنیادی اصولوں سے جو خدا نے آپ کی پیدائش کے ساتھ تخلیق کئے تھے وفاداری سکھاتا ہے وہ کبھی کبھی بدلا بھی ہو جاتا ہے اور کالٹا بھی ہے ایک شخص کو ہالے کتے نے کانا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ میں انجمن تولا گدیتا ہوں مگر پھر بھی آپ پر ہالے کتے کا اثر ہو جانے کا احتمال ہے اور یہ بھی اندیشہ ہے کہ نبوت آپ کے وصال تک پہنچ جائے۔ بہر حال میں شام کو پھر آؤں گا۔ شام کو گیا تو دیکھا کہ وہ شخص زور شور سے کانڈ پر کچھ کھڑا ہے۔ ڈاکٹر سمجھا کہ وصیت لکھ رہا ہے۔ خوش ہو کر کہا آپ بڑے بکھدار انسان ہیں۔ یہاں چاہے کہ آپ مرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس نے کہا "کیا مجھے ہالے کتے نے کانا ہے کہ وصیت لکھوں؟ میں تو ان لوگوں کی قبرست بنا رہا ہوں پنہنیں ہالہ ہو کر میں خود کا نوں گا۔"

حضرات! میں بھی سمجھا یہ محسوس کرنے لگا ہوں۔ اس لئے بہتر ہو گا کہ آپ سے رخصت ہوں۔



خون ریزی اپنے اوپر جان کر لی مگر جب زمین حاصل کر لی تو اس کو باغیر کاشت کے چھوڑ دیا بلکہ اس کی کاشت اور لوگوں کے سپرد کر دی۔ تو میرے عزیز واپس زین خود کاشت کر دواور پانی کے لیے ٹالیاں بھی بنا دواور جس طرح زراعت والے آپ کو کوئی صاف کرنے کی ہدایت کرتے ہیں اسی طرح دماغ کی ٹالیاں بھی صاف رکھنا کہ پانی کے ظہر نے سے عظمت پیدا نہ ہو اور کشت خیال چھروں کی پرورش کا وہ نہ بن جائے اور اس میں تازگی رہے۔ سیکرٹری صاحب کے افتتاحیہ الفاظ پہلے خسرے کو چھوڑ کر مجھے بہت پسند آئے۔ پھر اچھا دیکھی کوئی ایذا برائیس۔ انہوں نے میرے متعلق کہا ہے کہ عدل و انصاف کی دنیا میں تو معروف تھا۔ اب "کچھ مرے سے" عوام میں بھی مقبول ہو چلا ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ "کچھ مرے سے" پہلے میں غامخ بہانہ فیر مقبول تھا۔ ناچار اپنے ہی موقع پر غامخ بہانہ کہتے ہیں۔ یعنی میری کیا مجال کہ ایسی گفتا فی اپنے متعلق کروں بہر حال میرا اشارہ اس سے اگلے جملوں کی طرف ہے جو اس طرح پر ہیں کہ عوام کے لٹاکندوں کی عدم موجودگی میں میری تقریریں عوام کے اندرونی خیالات کی ترجمانی کرتی ہیں کیونکہ قدرت کو خلافت نہیں۔ یہاں غری خیال کی قدرت کو خلافت نہیں ایک گراہ خیال ہے اور اب تک میرے رسیدہ خیالات اس سے دو چار نہیں ہوئے تھے۔ اب سوچا تو معلوم ہوا کہ قدرت کو خلا کا پر کرنا بھی مخور ہے اور میزان کا قائم رکھنا بھی اور ان دونوں باتوں کا ایک ہی مطلب ہے۔ یوں تو سورہ الرحمن سیکڑوں دفعہ پڑھی اور سنی ہے مگر سیکرٹری صاحب کی افتتاحی تقریر سے اس کے بعض حصوں کی اہمیت واضح ہونے لگتی ہے "خلق الانسان علم البیان" خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو بیان کرنا سکھایا۔ اور آپ اگر اپنا درود دل بیان نہ کر سکتے تو کوئی اپنی پیدائش کا شفا پر نہیں کرتے۔ "واسما وضع المیزان" اللہ تعالیٰ المیزان و اقبوا الوزن بالسطر والاخر و المیزان" تین دفعہ میزان کا ذکر آیا ہے آسان کو اونچا کر کے انسان کے لیے توازن کا اصول قائم کر دیا ہے تاکہ میزان عدل میں کبھی نہ آئے۔ اور فرمایا کہ توازن کو انصاف کے ساتھ قائم کرو اور میزان کو خسارے میں نہ ڈالو مگر جس قدرت نے آپ پر میزان کی اہمیت اتنی صراحت سے واضح کی ہے وہاں اس کا بھی خیال رکھا ہے کہ بعض دفعہ آپ کے خیالات میں غلطیاں آ جاتی ہے اور دیگر چیزوں کے ساتھ خوداری کا مال و متاع بھی بہرہ جاتا ہے۔ اس لئے قدرت نے آپ کی سرشت میں بھی توازن رکھا تاکہ اپنے کردار کے باوجود آپ ڈوب نہ جائیں بلکہ تیرتے رہیں مجھے نہ سیاست سے کام ہے اور نہ سیاست کو سمجھتا ہوں البتہ اس بات کو بہت اہمیت دیتا ہوں کہ لوگ بڑل نہ ہو جائیں۔ اور ان کے حوصلے پست نہ ہوں اور ان کے خیالات دب کر ان کے جذباتانیت کو مجروح نہ کر دیں۔

مگر اسے اصحاب کف! اچھے اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آپ کی کل تعداد کتنی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ تین ہیں اور چوتھا

کہتے ہیں۔ پھر میاں شیر نے کھڑے ہو کر ایک چھوٹی سے تقریر کی کہ جناب والا! لاہور کے شہری آپ کو الوداعی وصیت دینا چاہتے ہیں اور آپ کے ارشادات سننا چاہتے ہیں۔

مجھے وہ امریکن جرنلسٹ یاد آیا جس کو میئر نے دانت دکھانے کے لئے کہا تھا۔ لوگ دانت دیکھنا چاہتے ہیں۔ لوگ ارشادات سننے آئے ہیں۔ ارشادات سننے کی بھی اس پر بھی خوش ہوتے ہیں کہ ان کو دانت دکھانے جائیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اچھی کے دانت ہیں دکھانے کے اور دکھانے کے اور۔ مگر جو باتیں آپ کے نزدیک ارشادات ہیں وہ دراصل میری آرزو ہیں میں گئی تھی اور میری کلکی آرزو یہ ہے کہ اپنے بچوں سے کہوں کہ تم تو ہمارے پتائے کے حامل میں پیدا ہوئے تم نے تو اپنے آباؤ اجداد کو یہی بار پہنائے دیکھا۔ ہمیں تو عادت ہو گئی ہے کہ مگر خدا کے لئے تم ہمارے سے دور رہو۔

میں نہیں کہتا کہ آپ کسی کی قدر نہ کریں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ آپ کسی کو صحت کا بندہ ہیں۔ یہ آپ کے بڑے افسر امیر ڈیرہ مومنا اعلیٰ لوگ ہوتے ہیں مگر جن و شام جموت سن کر ان کی طبیعت سا زہا ہو جاتی ہے۔ جموت کا حامل مرطوب آب و ہوا کی طرح ہے۔ جس سے کوہ قسبی کی شکایت لاحق ہو جاتی ہے۔ میرے ایک دوست نے جو کچھ کہتے تھے کراچی سے آئے ہیں۔ کراچی کے بعض لوگوں سے کہا۔ عجیب بات ہے کہ آپ ان موجودہ حکومت والوں کو بھی اسی طرح بار پہناتے ہیں جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو پہناتے تھے۔ یہ بتا رہے کیسے سمجھیں گے کہ ہم میں اور ہمارے حقدار میں کچھ فرق ہے۔ ان لوگوں نے میرے دوست سے کہا کہ آپ سے پہلے وہ خبروں نے بھی ایسی باتیں کی تھیں۔ اگر سچے تغیر ہو تو کوئی بھڑو دکھائے۔ ان سے جواب دیا کہ آپ سے کلکی اسٹن نے بھی یہی کہا تھا اور ان کو بھڑو دکھائے گئے تھے پھر انہوں نے کیا نصرت حاصل کی۔ رات کو سوتے تو ابھی مجلس وزارت تھی صبح اٹھے تو کچھ بھی نہ تھا۔ کبھی دو دنوں کی زہریلی اور پہلی باغ میں کل رکھ ہو گیا۔ کبھی لا قانونیت کی ٹکڑی حیرت خیال کے آستان پر پہلے بالوں کی طرح چھائی۔ اور سب کچھ بیلا نظراً لے گا۔ انجی دنوں میں جب لا قانونیت کا دور دورہ تھا۔ ایک بہت بڑے شخص نے پشاور یا تحصیل کی چند رو سا کو تھالہ خیال کے لیے کھانے پر بلا یا۔ ان دنوں ہمیں جس روپے میں حق گورنمنٹ نے چند رو مولد روپے من ترس مقرر کیا تھا اس کھانے سے پہلے دو مہمانوں نے آپس میں صلاح کی کہ میرا بن گرامی کو بتائیں گے کہ اس قیمت پر چند بن ماز میں جس آتی اور اس لئے خوب زور دھو رہے ہیں۔ ایک رات تک ہو رہی ہے۔ جب کھانے پر بیٹھے تو میرا بن گرامی نے حاضرین سے ایک عام سوال کیا کہ گندم آج کل کیسے فروخت ہوتی ہے۔ ایک شخص نے سمجھتے سے کہا کہ یہی بارہ چودہ روپے من۔ میرا بن گرامی یہ سن کر بارش باغ ہو گئے اور فرمائے گئے کہ وہ چار روپے بڑھ بھی گئے تو میں برداشت کر سکا ہوں۔ اسے

میں ان دنوں میں سے ایک نے منکھولا کہ صورت حال سے میرا بن گرامی کو آگاہ کرے مگر دوسرے نے اشارے سے روک دیا اور اس کا منکھولا کا کھلا رہ گیا۔ کھانے کے بعد ہمارا کر اس نے اپنے دوست سے پوچھا کہ اس نے سچ بات بتانے سے اسے کیوں روکھا تو اس کے دوست نے کہا "کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ میرا بن گرامی پہلے شخص کی چھوٹی قیمت سن کر کتنے خوش ہوئے تھے۔ آپ اگر انہیں یہی بات بتاتے تو وہ چار روپے ہو جاتے۔ بھائی ہم اپنے میرا بن گرامی کو ناراض کرنے تو نہیں گئے تھے۔" اس کے بعد میرا بن گرامی جہاں بھی گئے۔ انہوں نے کہا کہ مسٹر ذرائع سے مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ جو قیمت حکومت نے مقرر کی ہے وہ گندم فروشوں کے لئے کافی منافع کی ضمانت رکھتی ہے۔ چنانچہ ہر منڈی میں گندم کی ڈھیریاں پڑی ہیں۔ یہ آخری بات ایک تھی۔ گندم کی ڈھیریاں اس لئے پڑی تھیں کہ عام آدمی خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا۔

صاحبان! اہم اقبال کے موقع پر جناب آغا شورش کا قصیر نے لاہور کے شہریوں کی طرف سے مجھے لسان پاکستان کا خطاب دیا تھا اور بعض لوگوں نے اس خطاب کو اس طرح گندہ شروع کیا جیسے لٹکان پاکستان ہو۔ ان کے خیال میں فرق صرف اتنا ہے کہ لسان کا لام (ل) لٹکان کے نو (ن) سے پہلے آتا ہے اور پھر سن (س) لٹکان کے شین (ش) سے پہلے آتا ہے۔ اور وہ کھل ایک لٹکان ہے اور یہ پوری زبان ہے۔ میرے منہ سے بے اختیار لٹکان کا فرق اٹکا ہے کہ اس میں رس ہے مجھ میں ہائے ہے۔ آپ نے شاید جرائی میں یہ شعر سنے ہوں۔ کبھی ان کی یاد تازہ کرنے سے زندگی میں تازگی آ جاتی ہے۔

اور چھٹا آ اور میں بھی سراپا درد ہوں
آم پر کیوں جم گیا میں بھی تو دینا درد ہوں

فرق اتنا ہے کہ اس میں رس ہے اور مجھ میں ہائے ہے

لسان پاکستان کا خیال یوں پیدا ہوا کہ اکثر اوقات لوگ دانش طور پر میری تقریروں سے غلط مطالب نکالتے ہیں اور جب سے "پالاک" نے لسان کا لفظ سنا ہے وہ کچھ حیرت اور اور کچھ بے اعتنائی کے ساتھ اپنے کندھوں کو ایک ایک انگری انگری جھنجھ دیتے ہیں گویا یہ کہہ رہے ہوں۔ "زبان یا من ترس کی دین ترس کی دین"۔

خدا کرے میری زبان ترس کی ہی رہے کیونکہ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ترس کا محاورہ بلا واسطہ استعمال نہیں ہوا مگر بعض لوگ ترس کا جواب لٹکان میں دیتے ہیں جیسے محاورے کے بموجب کوئی اینٹ کا جراب جھڑے دے۔ اس مقام پر بتانی کہ مجھے وہ خط یاد آ رہا ہے جو کسی نے آٹھ دنوں میں دیا ہے مجھے کھانا کھانا کھانا یہ تھا۔ "نہایت سرت کا موقع ہے کہ آپ عزت و آبرو کے ساتھ

جودل میں ہے آنا منم بن کے آ پٹار کے پلے

میرے عزیز شہری!

بہت دنوں کی بات ہے کہ گاؤں میں ہمارے بڑوں میں ایک لامانی رشتہ تھی۔ اس نے اپنی پوتی کی شادی بارہ تیرہ برس کی عمر میں کر دی اس کے بعد ہر سال بلانا تھا ایک بچہ ہونے لگا۔ اس ذکر کے سینے میں مونٹ بھی شامل ہے۔ وہ نو عرصوں چوبیس سال تک رہیں بنی رہی۔ عورتیں ملنے جاتیں تو ہمیشہ ایک ریٹیم کے رومال سے اس کا سر بندھا ہوا دیکھتیں۔ اس کے چہرے پر ایک دائمی اطمینان نظر آتا تھا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ یا تو ہمیشہ شادی ہوا کرے یا ہمیشہ بچے ہوا کریں تا کہ میں بونجی بن سنور کے ٹھنکی راہ کروں اور لوگ پوچھنے آیا کریں۔ زرد چرے پر سیاہ رومال دے دیے یا چھانکنا ہے خصوصاً اگر آنکھوں میں ہلکا سا سرمہ لگا دیا جائے اور آنکھوں کے باہر ہلکا سا لکھنا ہوا ہو۔

حضرات! یہ انورانی پارٹیاں جہاں سے شروع ہوئی تھیں اور نہ جانے کہاں ختم ہوں مجھے اس لڑکی کی یاد دل رہی ہیں جو چاقی تھی کہ ہمیشہ مرکز کو زخمی کرتی رہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی ہمیشہ رنڈا نہ ہوتا رہوں۔ آپ نے مجھے دو سال قبل کیوں نہیں بتایا کہ رنڈا نہ ہونے پر میں اس قدر ہر طرح سے ہوجاؤں گا۔ تھم احمد شجاع نے بجلی گرمیوں میں ہر طرح کے لفظ پر اعتراض کیا تھا اور کہا تھا کہ دوسری جگہوں پر آپ بے شک ہر طرح سے ہوں لیکن لاہور میں اہم محبوب کا لفظ استعمال کریں گے۔ ان کو معلوم نہیں کہ پٹار کے لوگ جب مشق و محبت کرتے ہیں تو پھر کوئی حد ان کی نظر میں نہیں رہتی۔ پٹار سے میرا تعلق صرف چار سال رہا ہے۔ اور وہ میری زندگی کے بہترین سال تھے۔ آپ کے پاس نے کی صداقت کے متعلق میری رائے کچھ بھی ہو یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے زندگی کی چار بہار یہاں گزار دی ہیں۔ اور اس شہر کے جن گھٹانوں میں یہ گزریں وہ اپنے دواؤں کا لکڑی شای باغ اور دزیر باغ تھے۔ شای باغ میں ہم ہفت ہال کھیلنے جایا کرتے تھے۔ میرے دوست جو بخش خاں جو غالباً پاسا سے کے مصنف بھی ہیں ہفت ہال نہیں کھیلے تھے۔ وہ کالج کے دنوں میں بھی سیاست میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جب وہ کالج میں داخل ہوئے تو میں ایک سال آگے تھا۔ آپ نے سنا

کی بھودی کے ضامن ہیں آپ ہمیشہ شہری آزادی کا شہرہ سنتے آئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ بات آزادی سے محروم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آزادی کا احساس شہروں میں پہلے پیدا ہوتا ہے اور شہری آزادی پر مجھے ایک بات یاد آئی۔ آپ کے شہر نے مجھے خطاب بھی دیا ہے۔ آپ کے شہر نے مجھے مزید اعزازات عطا کئے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ مجھے اس شہری آزادی بھی مل جاتی۔ آپ نے سنا ہوگا کہ جب کوئی ممتاز شخص انگلستان جاتا ہے تو لندن کا لارڈ میئر اس کو بلدیہ لندن کی آزادی دے دیتا ہے جس کو FREEDOM OF THE CITY OF LONDON کہتے ہیں۔ اگر لارڈ میئر کی شہری آزادی مجھے مل جاتی تو کبھی میں موچی دروازے کے اندر چلا جاتا اور کبھی باہر اور چونکہ دروازہ وہاں کوئی نہیں ہے اس لئے اندر جانا بالکل آسان ہے۔

مدت ہوئی میں نے آخر شیرانی کے کچھ روپائی اشعار پڑھے تھے اور پھر اس امید پر یاد کر لے تھے کہ اگر کبھی ”حسب حال“ ثابت ہونے تو جو ان کا اہل ہوگا اسے ستاروں کا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اشعار لاہور کے شہریوں کے سامنے پیش کروں جو انارکلی اور موچی دروازے سے اپنا ہی باغ اور شاہدہ سے اور نہ جانے کہاں کہاں سے آئے ہیں۔ جنہوں نے پندرہ سال پہلے لکڑیوں کے ساتھ تلواریں اور بند قوتوں کا مقابلہ کیا تھا۔ وہ غالباً مجھے شہری آزادی دینے پر تیار ہو جائیں گے۔ وہ اشعار یہ ہیں

مدت سے محبت کرتا تھا سو جان سے تم پر مرتا تھا
جب راتوں کو رہتا رہتا تھا جب راتوں کو آہیں بھرتا تھا
ہاں راتوں کو آہیں بھرتا تھا پر تم سے کہتے ڈرتا تھا
آج اس کی جرات کرتا ہوں میں تم سے محبت کرتا ہوں

اس میں جو مبالغہ ہے اسے درگزر کیجئے۔ راتوں کو میں نہیں رو یا دن ہی کافی تھے سو جان سے بھی نہیں مرا۔ ایک ہی جان کافی تھی حاضر ہے۔



قصین کی ایسی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے اس لئے کہ اقبال نے تو سب ہی کے بارے میں حکم لگا دیا ہے۔ ”مئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے“

نتیجہ یہ ہے کہ اب وہ نہ عشق میں گری رہی نہ پشامری کھوں میں وہ خوشی مگر پھر بھی ہر دور میں یہ کوشش رہتی ہے کہ گندے انڈوں کو الگ کر کے لیڈو کر دیا جائے اور اب یہ لیڈو و ایک قسم کا سرد خانہ بن گیا ہے جس میں عکسے مائلے اور آلو کے علاوہ گندے انڈے بھی رکھے جاتے ہیں۔ بچپنی گریبوں میں میں اسٹیت آف ہاڈمیں جاتو ایک مری نے ایک چٹنی مالے کی پشامری کے کولڈ سٹور میں سے نکال کر کھج دی۔ دو دن بعد ان مائلوں پر سیاہ داغ پڑ گئے اور اذاتہ بھی بدل گیا کسی نے تشریح کی کہ یہ حضرت عائشہؓ عکسے مائلے جب سرد خانے میں رہتے ہیں تو ان کی زندگی معطل ہو جاتی ہے سرد خانے سے نکلتے ہی اپنی اس حالت پر واپس آ جاتے ہیں جو سرد خانے سے پہلے تھی۔ چنانچہ اب ایسا نظر آتا ہے کہ یہ گندے انڈے یا جن کو آپ نے گندا کہا تھا لیڈو کے سرد خانے میں رہ کر کھج و سالم ہو گئے ہیں۔ اور اس لیے آپ ”قوتو“ مارا چہ از اس قند“ کہہ کر جب انڈوں کو گندا کہا جائے تو کہیں کیا مضائقہ ہے اور جب انڈوں کو اچھا کہا جائے تب بھی کہیں کیا مضائقہ ہے اور یہ صورت آرام کی ہے کیونکہ آپ کو سو چنا نہیں پڑتا۔ یا پھر اگر فطرت نے آپ کو سوچنے کی اہلیت میں جلا کیا ہے تو ایک ذہنی اشتہار کے عالم میں آپ اپنے ضمیر سے پوچھیں کہ کیا کچھ ہے انڈے گندے تھے یا سیاست میں انڈے گندے ہی ہو کر رہتے ہیں۔

میں کہا ہے کہاں پہنچ گیا۔ میں تو کہتا تھا کہ ایک دفعہ وہ عشق کی جماعت نے کسی سیاسی تحریک میں سارے کالج کو بند کر دیا تھا اور پھر لڑکوں کا جلوس نکالا تھا“ مجھے پہلے ہی احساس تھا کہ کچھ معرکہ ہوئے والا ہے اس لئے جھپٹی کی درخواست بھیج دی کہ میں ”عقین“ یعنی بھارہوں اور یہ عقین کا لفظ حضرت ابراہیم سے سیکھا ہے چنانچہ میں کتابیں لے کر روز باری میں چلا گیا۔ کیونکہ بھاری عاقبت طبعی کی تھی۔

یہ چار سال تو کالج کے تھے اس سے پہلے میں دوسری اور تیسری جماعت کا طالب علم رہا تھا۔ اس وقت میرے والد صاحب گورنری میں رہتے تھے وہاں سے اسلامپور سکول تک فیز جیل کا راستہ ہے وہاں ہی پریموک لکٹی تھی تو میں دکان سے ایک کچھ خریدتا۔ آپ سوچتے ہوں کہ پشامری میں میری زندگی زیادہ تر کھوں کی خریداری میں گزری ہے مگر اس دن میں نے کچھ نہیں خریدا کیونکہ ہیرنالی میں گر گیا تھا اور نالی گندے پانی کی تھی اور پھر گہری تھی جی۔ میں روئے لگا کر ایک ہم جماعت کے آنے پر شرمایا اور غمزدہ لے کر چل دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری قسمت میں یا تو گندے انڈے ہیں یا گندہ یا مایاں۔ ان گندہ نالیوں میں اگر کسی کا ایک پیر

ہوگا کہ کالج میں طلباء پہلے سال کے لڑکوں کو تھو مشق کچھ کر خوب بناتے ہیں مگر جس سال ہر بخش مائل پہلے سال کے طالب علم تھے تو ان کی کلاس کے طلباء کالج کے باقی لڑکوں کو بنایا کرتے تھے۔ ان کے لیڈو چار کھتے تھے۔ یاد نہیں کہ ان کے متعلق چار یا دو کا لفظ پہلے کس نے استعمال کیا تھا۔ ہر بخش دوست دین خواجہ امیر شرف اور چائیس۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ چائیس کا لفظ ان کے لئے کیوں استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن وہ شروع سے ہی چائیس کہلاتے تھے۔ اب ممکن ہے کہ وہ اس کے مرے تک پہنچ گئے ہوں۔ بعض لوگ ساری عمر ہی چائیس رہتے ہیں۔ ایک دن ہم کالج سے شہر کی طرف جا رہے تھے۔ ریلوے سٹیشن کے پاس سے گزر رہا۔ چند عقیدہ ریل گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں نے کہا کہ یہ چیف کمشنر کی مخصوص ٹرین ہے۔ چائیس چائیس بولے۔ رحیم بانوں گا کہ اس ٹرین کے مہدے تک پہنچیں۔ وہاں تک تو میں نہ پہنچ سکا لیکن اگر آپ کے دلوں تک پہنچ گیا ہوں (اور آخر آپ کو بھوت بولنے کی کیا ضرورت ہے) تو پھر سفیر ٹرین کی کیا حیثیت ہے۔ ایک وجہ ان تک نہ پہنچنے کی یہ بھی ہے کہ ریل گاڑیوں کے ذریعے بھی گزشت کی طرح رنگ بدلنے لگے ہیں اس لئے سال دو سال سے زیادہ کوئی مسافر نہیں کر رہا۔ چائیس چائیس کی لیڈو پکڑ کر ہاتھ۔ یہی پہلے سال کے طالب علم تھے جنہوں نے ایک دفعہ سارے کالج میں سڑا ٹیک کر دی تھی۔ ان دنوں لڑکے اس وجہ سے بڑبڑاتے ہیں کہ تھے کہ احمقان تخت ہیں یا سڑا کر کے پانسی نرم ہے ان دنوں ہم سیاسی آزادی مانگ رہے تھے۔ بھاری ساری عمر آزادی مانگتے مانگتے گزرتی اور شاید یہی حسرت لے کر ہم مر جائیں گے۔ ویسے مجھے ایک گوند ملی ہوئی ہے جب میں شہر پشامری سے کھٹشوانی بازار میں شہیدوں کی یادگار کے قریب موٹر کھڑی کر رہا تھا۔ ایک دفعہ کسی شخص نے مجھ سے کہا کہ وہ خود تو اتنا یاد نہیں کر چکا تھا میں جانے کے لئے تیار ہو لیکن اگر کوئی اور شخص جیل جا رہا ہو تو وہ اس کی قدر کرتا ہے۔ اور اگر پھول قریب ہوں تو ہار بھی پرہتا ہے۔ بس اس قسم کی تسکین مجھے بھی یادگار شہیدان آزادی کے پاس موٹر کھڑی کرنے پر ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یادگار کے قریب ایک گلی میں جسٹین کھوں کی بھی ایک دکان ہے اور اس سے بھر جسٹین کچھ پشامری کھوں میں کھیں نہیں لےئے۔ بچپنی گریبوں میں تو میں نے دکان والے سے کہ آپ کے کچھ بھی سیاست کی طرح بے حزمہ ہوتے جا رہے ہیں۔ نہ صرف ایاز میں وہ غمزدہ آزاد پاکستان کی آزادی میں وہ چاشنی۔ نہ آپ کے کھوں میں وہ ذائقہ۔ اس نے کہا ہادی انڈے ہیں وہی میدہ ہے۔ وہی میں ہوں۔ میں نے کہا کھانے والے بھی وہی ہیں۔ مگر شاید آپ گندے انڈے بھی استعمال کرنے لگے ہیں۔ اس نے تسلیم تو نہیں کیا مگر مجھے گندے انڈے تو ہیں جن سے ہم بڑا ہو گئے ہیں اور جن سے کھوں کا فیر خراب ہو گیا ہے۔ اب یہ پوچھیں کہ جرائے استعمال کئے جا رہے ہیں ان میں کتنے انڈے گندے ہیں اور کیا ایک گندہ کی گلی کی طرح وہ بھی اور انڈوں کو گندا کر سکتے ہیں۔ کچھ تو یہ ہے کہ میں گندے انڈوں کے

بھی گم ہو جائے تو وہ اس کے لئے بچپن سے لے کر ساتھ برس تک رہتا ہے اور اس کو دتا دیکھ کر مہینے ہیں۔ جب وہ ایک مہینے سے کچھ زیادہ وقت والی چیزوں مثلاً بنیادی حقوق کے لئے محصل روئے کی عقل بناتا ہے تو ہم ناراض ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ حقوق واقعی بنیادی ہیں اور ان کو کھود دینے سے کسی کو تال نہیں ہے تو کیا ہم اپنی بنیادیں نہیں کھودیں؟

حضرات! ان سائنسوں میں جو اب تک میرے متعلق سب ہوئے ہیں ایک بات جو بار بار میرے نوٹس میں لائی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ جب لوگوں کی زبان میں کلمہ تھی تو میں ان کی طرف بول رہا ہوں جب شاہراہ حیات آنکھوں سے اوجھل کر دی گئی تھی تو میں اسے شعلوں سے روشن کرتا رہا۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پڑھے لکھے لوگ تھے جن کے ہمیں کلمہ کر دیا تھا اور ہمارے راستے تاریک کر دیے گئے تھے لیکن ہے کہ کبھی کبھی کلمہ ہونے میں قاصر ہو۔ اگر صاحب بصیرت کہے کہ ہمیں کلمہ رہنے میں قاصر ہو، ہاتھ پیریں ٹھیک ہوگا۔ بس مجھے یہ ڈر تھا کہ کلمہ رہ کر لوگ کسی اور زیادہ خطرناک مرض میں مبتلا ہو جائیں۔ ایک دفعہ بہادر افسر لڑائی میں مارا گیا۔ جب اس کی لاش گھر پہنچی تو اس کی بیوی بھائے روئے کے لاش کی طرف گھوری رہی۔ لوگوں نے یہ دیکھا تو سمجھے کہ اگر اس کی یہ حالت تھی تو جلدی مر جائے گی کیونکہ غم میں رہنا ایک فطری امر ہے اور نہ وہ نے سے دل و دماغ پر دباؤ پڑتا ہے۔ ایک سن رسیہ ہو عورت نے جب یہ دیکھا تو اس کے شیر خوار بچے کو اس کی گود میں ڈال دیا۔ بچہ گود کچھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے گی اور بولی۔ "میرے لال اب میں تیرے لئے نہیں کی۔"

میں نے اتنا ہی کیا کہ لوگوں کی گود میں امید کا بچہ ڈال دیا اور رانے سے مراد یہ تھی کہ ایک تو فحش ان کو نہ کھا جائے اور دوسرے اپنے ماضی کی بدعنوانیاں پر دوسرے محرم میں نیک لوگ کہا کرتے ہیں کہ جو خود روئے یا رانے یا روئے کی صورت بنائے تو وہ داخل جنت ہو جاتا ہے۔ یہ میں نہیں کہ سکتا کہ تینوں باتوں میں میں کون سی صورت کا زمرہ دار تھا اور دوسرے لوگ کون سی بات کے منکر تین صورتیں فریب کی تھیں اور کم از کم میں آپ کے دل کی جنت میں تو داخل ہو گیا۔

اگر میں نے اس طرح کیا تو اس خیال سے کہ سب لوگ ہیں ایک ہم سب کا مقصد ایک ہے اور سب کا ملحق نظریہ ایک ہے یعنی قوم کو مدد دینا۔ میں نے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا کہ میں قوم کی اصلاح کے لئے کوئی مشن لے کر آیا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بات میں نے کسی خاص ارادے سے نہیں کی۔ تقریریں لکھتے وقت کوئی خاص مقصد میرے پیش نظر نہیں ہوا کہ تاریخیں لکھتے لکھتے کوئی خاص مقصد خود بخود کھنچ آتا ہے اور کیونکہ ایک طرف مجھے اپنے غلوں پر اور دوسری جانب آپ کے غلوں پر اعتماد تھا۔ میں نے جانتا تھا کہ اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہناؤ یا اس بات کا میں نے اس وقت بھی اعتراف کیا اور اب بھی کرتا ہوں کہ اگر وہ چاہے تو اس چیز کو

میں آپ مشعل کہتے ہیں آسانی سے بجا سکتے تھے۔ بہر حال مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ کم از کم پڑھے لکھے میں ایسے کچھ والے لوگ ہیں جو نازک مقصود پر کتابیں لے کر دوزخ باغ نہیں چلے جاتے۔ جب وہ سوچتے ہیں تو ملک کی ترقی کے بارے میں سوچتے ہیں۔ مجھے وہ ذہنی رجحانات نظر آ رہے ہیں جس سے قومیں بنی ہیں اور اس کا ثبوت اس شہر کے سپاس سے میں شدت سے پایا جاتا ہے مگر آپ کے سپاس کا کیا کہنا۔ میں نے ذرا غور سے دیکھا تو اس میں ایک صفت یہ بھی نظر آئی کہ ہر ہی انکشاف کے شروع میں مجھے ایک ملحدہ نام یاد آیا ہے اور یہی انکشاف کا مضمون اس کی تشریح کرتا ہے مثلاً جہاں مجھے "کامیاب ملت" بنایا ہے وہاں شہریوں کے بنیادی حقوق کی کھجاندہ میرے سر پر کی ہے اور جہاں محض زور دیا گیا ہے وہاں تک و تار یک رستوں کو روشن کرنے کے لئے میرے ہاتھ میں مشعل دے دی گئی ہے اور جہاں "مشعل دوست" بنایا گیا ہے۔ وہاں قوم کی قومیں پیدا کرنے اور صحیح شعور پیدا کرنے کی خدمت مجھے تفویض کی گئی ہے۔

جہاں فاضل ادیب کا خطاب دیا ہے وہاں طرز بیان میں کثرت و مفران کا رنگ دیا اور اگر یہ ہائے بے اختیار کا سیلاب نظر آتا ہے البتہ ایک خطاب میری سمجھ میں نہیں آتا یعنی جہاں "واجب الاحرام بزرگ" کہا ہے وہاں ان اعتراضوں کی طرف اشارہ ہے جو میری تقریریں پر اس وجہ سے ہوئے ہیں کہ تقریریں کرتا ایک بیچ کے منصب کے منافی ہے۔ آپ نے اس کا اچھا جواب دیا ہے۔ تحران اعتراضوں کی وجہ سے میں کیوں واجب الاحرام بزرگ بن گیا۔ شاید آپ کا خیال ہے ہو کہ لوگوں کو اس بات کا زیادہ احترام کرنا چاہیے کہ ایک بیچ بھی اپنے منصب میں بے قرار ہو سکتا ہے۔

بیچ کا دل سنگ و شست کا نہیں ہوتا مگر اس کی آواز میں آپ مجھے ڈارنگ جنس کہتے تو موزوں ہوتا کیونکہ جنس ڈارنگ بھی تقریریں کیا کرتے تھے اور یوں بھی ڈارنگ کا لفظ اچھا ہے۔ آپ نے اعتراضوں کا جواب یہ دیا ہے کہ شائستہ قوموں نے عدل و انصاف کے قصور کی تھگیں اس طرح کی ہے کہ اس کا جسم یا تو ایک آکھ کے ساتھ بنایا ہے یا پھر آکھ کے۔ ایک آکھ سے مراد یہ ہے کہ سب کو ایک آکھ سے دیکھا جائے اور اندھا ہونے سے یہ مطلب ہے کہ انصاف کی ترازو و چشم ظاہرین کے فریب کے متاثر نہیں ہوتی۔ انصاف کا جسم و تائی سے تو محروم ہوتا ہے لیکن گویا بی بی سے محروم نہیں ہوتا۔ یہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا کہ اس کے ہونٹوں پر ہر ہو یا وہ طے ہوئے ہوں۔ میرے خیال میں ایسے لوگ مجھے کاٹھ نہیں سمجھتے۔ وہ اسے بت کہتے ہیں اور تو جہاں ہی دلہن رہتا ہے جب منہم بنے آئے وہ جنت جگہ لوگ کہتے ہیں کہ بت کی طرح کیوں کھڑے ہو جوتان کے کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آغوش میں زبان رکھتے ہو ذل میں تپ رکھتے ہو۔ سر میں بھرتے ہو کچھ تو منہ سے بولو۔ اب یہ تو صاف بات ہے کہ اگر مجھے یہ

زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

خطبہ افتتاحیہ فیروز سزرا واپنڈی

بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے۔ جون کے سینے میں آغز واپنڈی میں ایک اشاعتی ادارے کا افتتاح کیوں ضروری ہے؟ اور پھر ایک چیف جسٹس اس کا افتتاح کیوں کرے؟ ممکن ہے کہ یہ سوالات آپ کے ذہن میں پیدا نہ ہوں۔ اور جب وہ آپ کے ذہن میں آئیں گے تو ان کے جواب سوچنے کے لیے وقت درکار ہوگا۔ مگر اس اثنا میں مجھے ڈاکٹر وحید کے ارداوں کے بارے میں آپ کے ذہن میں شکوک پیدا کرنے کا مسرت بخش موقع مل گیا ہے اور آپ کو اور زیادہ سراسر کرنے کے لئے میں آپ کو یہ اطلاع دیتا چاہتا ہوں کہ ان کے اصل پروگرام کے مطابق یہ تقریب جون کے مہینے وسط میں منعقد ہونے والے تھی۔ جب گرمی کی لہر آنے کے زیادہ امکانات ہوتے اور جب قومی اسمبلی کو (جس کا اجلاس 8 کو شروع ہونے والا تھا)۔ اپنے فلسفے کی وضاحت کے لئے پورا ایک ہفتہ چکا ہوتا۔ ڈاکٹر وحید نے سوچا تھا کہ انہیں یہ فیصلہ کرنے کا موقع دینے کے لئے سات دن کافی ہوں گے۔ وہ اپنے تجزیے کو اسمبلی میں پیدا ہونے والی گرمی سے آگ بھڑکا کر نہیں یا موسم سے پیدا ہونے والی گرمی کی لہروں سے۔ لیکن میں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ اسمبلی کا خیال ڈاکٹر وحید کے ذہن میں نہیں تھا۔ ایسا ہوتا تو وہ اپنا خطبہ اردو میں نہ لکھتے۔ آپ نے ابھی ابھی جو خطبہ بنا ہے وہ دراصل ترجمہ ہے بالکل اسی طرح جیسے دورِ مہم جس کا خطبہ میں نمایاں طور پر ذکر کیا گیا ہے شہرۂ آفاق افسانوی ہیر و کھنڈ ایک گیس ہے ایک خراب ٹکس بلکہ درحقیقت قلبِ نابیت ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ ستان کا رسم جب زمین پر چٹا تھا تو اس پر کیا اتفاق پڑی تھی وہ اتنا طاقتور اور عظیم تھا کہ جب دورِ یک زار میں چٹا تھا تو اس کے پاؤں ٹخنوں تک ریت میں دھنس جاتے تھے۔ ان دنوں پائنت سوئیں نہیں ہوتی تھیں اس لیے اس نے خدا سے دعا کی کہ اس کی تھوڑی سی طاقت واپس لے لی جائے۔ اس وقت زمین پر بہت زیادہ انسان نہیں تھے اور خدا انہیں کسی واسطے کے دعا میں سن سکتا تھا۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ جب خدا زمین اور اس کی خلافت کی تخلیق کر رہا تھا اس وقت آج کل کے ٹیکریڈی وڈر اور شیر اس کے پاس ہوتے تو وہ کیا مشورہ دیتے۔ فرشتوں نے دربارِ خداوندی میں عرض کیا کہ انسانوں سے کسی بھلائی کی توقع نہیں جاسکتی۔ کیونکہ وہ اسمبلی میں تقریریں کرتے ہیں

افتخار دیا جائے کہ آپ کے دلوں میں بت بن کے آؤں یا ضم تو میں ضم بن کے آؤں پند کروں گا اور اس طرح آپ کا شکر یہ بھی ادا کر سکتا ہوں۔

جو دل میں ہے آنا ضم بن کے آ
خدا بن کے آنے سے کیا ناکہ



اعزاز میں لاکھا کر ڈاکٹر وحید کے لئے یہ کنکشنز میں موقع تھا۔ البتہ میرے لیے یہ یقیناً زندگی کا بہترین موقع تھا۔ کیونکہ گزشتہ سال مجھے چائٹ گام پارلیمنٹری ایجنٹ کی طرف سے دعوت موصول ہوئی تھی کہ میں اس کے عام چائٹس میں شرکت کروں جو اسی سال بعد منعقد ہوا ہے۔ کتنی طویل ہے یہ مدت عمری اس موقع سے لاکھا نہیں اٹھا سکا۔ آپ خود ملاحظہ کریں کہ یہاں سے چائٹ گام کتنی دور ہے۔ میں نے کہا کہ خدا نے کوئی سبب پیدا کر دیا تو آ جاؤں گا۔ بالکل (اسی طرح جیسے انے قومی اسمبلی کے ارکان کے لئے سبب پیدا کر دیا ہے۔ مگر خدا نے کوئی سبب پیدا نہیں کیا اس لیے میں نے خود ایک موقع نکال لیا ہے لیکن طبعی کی کمی کے باعث یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ تقریباً آدھ سال گزر گئے ہیں لیکن اب میں مکان بنانے کے لئے حکومت سے روپیہ قرض لینے کے لیے ایک درخواست دی تھی اور اس پر مجھے اطلاع دی گئی کہ مجھے اس صورت میں قرض مل سکتا ہے کہ میں کراچی لاہور ڈھاکہ یا چائٹ گام میں مکان بنائوں۔ بعد میں ایک فیصلہ کے ذریعے ان پانچ جگہوں میں روپے لپٹی کا اضافہ کر دیا گیا اور ادارہ اقوام متحدہ کے مقابلے میں یہ آگے کی جانب ایک بہت بڑا قدم ہے جہاں ابھی صرف چار بڑوں کو اپنے دین کے گناہوں کو ادا کرنے کے ارادے کی اجازت ہے۔ اور اس ادارے کے آئین میں اتنی بھی لچک نہیں ہے کہ وہ کوئی فیصلہ غلط نامہ جاری کر سکے۔ کیا آپ نے کبھی اعزاز لگا دیا ہے کہ وہ آدھ اور دین میں صرف کیفیاتی فرق ہے اور (انگریزی میں) یہ دونوں الفاظ صرف حروف کے ہیر پھیر سے بن جاتے ہیں۔ آپ کو اپنا حق ڈھانپنے کے لیے پارلیمنٹ کچلواں کی ضرورت ہے اور قیاس کا دامن کو نہ لگے بلکہ لہا ہوا اور چٹلون کی الاٹھائی کر تک ہو تو آپ دیندار و دھت کا فرق سمجھ لیں گے اور آپ کے لیے یہ ممکن مشکل نہ ہوگا کہ فریڈ اور ہولوڈو میں بین الاقوامی چھوڑی پر مال کے دوران میں چار بڑے ایک دوسرے کی چٹلون کی طرح پہننے لہا لیکن چائٹ گام سے اقوام متحدہ تک ایک اور فائدہ دھما ہے اس لیے بہتر ہے کہ میں سمندر پار کے دین سے اپنے ملک کے دھت پر واپس آؤں۔ جہاں ان دونوں سے قطع نظر جن کا علم آپ کو مجھ سے زیادہ ہے چھوٹے چھوٹے دین بھی موجود ہیں جن میں یہ دین بھی شامل ہے کہ آپ ایبٹ آباد میں مکان بنانے کے لیے قرض حاصل نہیں کر سکتے۔ اس پر میرے ان دوستوں نے جو جانتے ہیں کہ ایسے دین اور قاعدوں کی خلاف ورزی کر کے کس طرح ان کا احترام کیا جاتا ہے مجھے مشورہ دیا کہ میں قرض کے لیے درخواست دے دوں اور یہ کیوں کہ میں چائٹ گام میں مکان بنانا چاہتا ہوں۔ یہ جگہ ممتاز افراد کے دوروں کے راستے سے مکھوت کرے۔ اس لیے کسی کو معلوم تک نہیں ہوگا کہ مکان نہیں بنا دیا گیا میں نے اس سے سوال کیا کہ میں کس طرح ایبٹ آباد میں مکان بنا کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ مکان چائٹ گام میں بنا دیا گیا ہے۔ اس پر مجھے مشورہ دیا گیا کہ اگر میں چائٹ گام جانے اور قطعہ زمین کے لیے بات چیت کرنے کا ثبوت پیش کر سکوں تو پھر معاملہ طوفان پر چھوڑا جاسکتا ہے۔ جو عورتوں کو

اپنی تیز بانوں سے غور نہایت ہیں اور بنیادی حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس فرشتوں کا طرز عمل کھوتی ہوتا ہے وہ خدا کی شوکت و عظمت کے گیت گانے کے سوا کچھ نہیں کرتے اور ان کا طرز عمل مشینوں اور بندروں سے نماش ہوتا ہے آدم اور فرشتوں کا یہ دل کش موضوع مجھے ہوشی اپنی اصل سٹی پر لے آتا ہے۔ جب میرا نام بیتان کے کریگ ڈار پر زور آزمائی کر رہا تھا اس وقت یہ گہرائی نکلنے سے زیادہ نیچی نہیں تھی۔ لیکن اب یہ دل کی گہرائی میں تبدیل ہو گئی ہے اس لئے اس خیال سے کہ میں محفوظ رہوں اسے آپ کے دلوں کی گہرائی میں جا کر زمین ہونے کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔ اور رحم کی اس دعا پر واپس آتا ہوں کہ اس کا قصور اسادین کم کر دیا جائے۔ خدا نے ایک آؤ بخش جاری کر کے رحم کی قوتی ای طاقت واپس لی۔ آؤ بخش میں حسب معمول یہ دینا چاہا مگر وہ ڈھاکہ ہر گاہ و رستم کی دو تانگوں میں بہت زیادہ طاقت جمع ہونے کی وجہ سے خود اسے تکلیف ہوئی ہے اور اس عاجز حق گو کو بھی جو زمین پر چلتی ہے اس لئے یہ قانون نافذ کیا جاتا ہے..... اس امر پر تاریخ کچھ مشکوک ہو جاتی ہے اور شیک شیک ہے نہیں کہا جاسکتا کہ طاقت کس طرح واپس لی گئی لیکن نتائج کا جائزہ لینے کے بعد اس کہانی کے کچھ مورخ کہتے ہیں کہ رستم کو اپنے حال پر چھوڑ دینا بہتر ہوتا کیونکہ اس صورت میں وہ فطری طریقے سے یعنی خود کا کم کر کے زور دینا وزن کم کر لیتا اور ایسے معمولی طریقوں کے اختیار کرنے کی ضرورت نہ پڑتی جیسے یہ کہ وہ اپنی چوٹی کی ٹکڑاؤں اٹھا ڈالے۔ آؤ بخش کی حکومت جو ایک تصویر کی حیثیت سے بظاہر صحت مند معلوم ہوتی ہے عملی طور پر ہمیشہ صحت مند نہیں ہوتی۔ لہذا بعد ازل خدا کے انجکشنز نے رستم کی طاقت اس طرح چھوڑ دی ہے کہ بیتان اور مغربی پاکستان کے درمیان جو ایک دوسرے سے متصل علاقے ہیں وزن میں بہت زیادہ کمی واقع ہو گئی ہے اور آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ دوسرا پاؤں سے کم ہو کر ایک سو بارہ پاؤں سے زوردار ہوا ہے اور اس زوردار پاؤں کے بارے میں بھی آپ کو کبھی چین نہیں ہو سکتا اور پھر جب یہ کہانی مشرقی پاکستان میں پہنچتی ہے جہاں تک صرف طیاروں کے ذریعے رسائی ممکن ہے تو یہ محض ایک ٹیکر خیالی رہ جاتی ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر وحید نے جب جن کے وسط میں رسم افتتاح کا فیصلہ کیا تھا تو ان کے ذہن میں اسمبلی کا خیال نہیں تھا۔ انہوں نے اپنا خطبارہ دوش لکھا تھا اور اس کا اسلوب بڑا اعلیٰ تھا اور چونکہ میرے لیے اس کی ہسری مشکل تھی اس لیے میں نے کہا ”مشرقی پاکستان والوں کا کیا ہوگا“ اور اس پر ڈاکٹر وحید کو خیال آیا کہ اگر مشرقی پاکستان والوں کو بھی باخبر کا مقصد تو ہے غلط انگریزی میں ہونا چاہئے پھر انہیں یاد آ گیا کہ انہوں نے اسمبلی کا اجلاس بھی ہوا ہوگا۔ اور اس کے ارکان کو کھمبو کر کے یا تار موقع ہے بالخصوص مشرقی پاکستان کے ارکان کو جو دوبارہ واپس نہیں آئیں گے کیونکہ موجودہ آئین کی یہی خواہش ہے۔ میں یہ

ان کی بنیاد سے اکھاڑ کر ایبٹ آباد ایسی جگہ پہنچا سکتا ہے۔ خوفان باصم چٹائی پر بیٹھ جاتا ہے اور کبھی کبھار اگر یہ قیصری روش اختیار کر لے اور ایک مکان کو مشرق سے اڑا کر مغرب پر پہنچا دے تو اس سے کسی کو صدمہ نہ کیسے پہنچ سکتا ہے۔

لیکن میں چاکلم فٹس گیا اور اگر سنے آئیں میں یہ بات موجود نہ ہوتی کہ پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس راولپنڈی میں ہو گا۔ تو آج کی افتتاحی تقریب بے جہان ثابت ہوتی اگر آپ آئیں میں ترمیم کا وعدہ کریں کہ مشرقی پاکستان کے ارکان ایک مہرہ ہمارے ہاں آئیں گے خواہ وہ وسط جرن ہی میں کیوں نہ ہو تو ہمارے ذہن میں چیئرمین کے ذرا سے سٹمرز ناٹ ڈسٹریکٹ کی یاد آتا ہے ہوا جائے گی۔ اور مجھے ڈاکٹر وحید سے وعدہ لینا پڑے گا کہ وہ ہر سال ایک پبلیک ہاؤس کھولا کریں گے اور اس کام کی ابتدا اسلام آباد سے ہوگی۔ اس ضمن میں انہوں نے ایک خاکہ پیش کیا کہ رکھا ہے جس کے ذریعے براستہ کوہمری اس کام کو ایبٹ آباد تک پہنچایا جائے گا۔ میں بھی ان اشائی اداروں کی افتتاحی تقریبات میں شرکت کا وعدہ کروں گا اور نہ اسلام کی زبان میں اپنی تقریر کروں گا۔ میں اس سلسلہ میں اقوام متحدہ کا بھی جائزہ لوں گا۔ بشرطیکہ یہ مقدس ادارہ اس وقت تک قائم رہا۔ میں نے 1970ء میں بنگالی کینے کا ارادہ کیا ہے اور 1971ء میں بنگالی میں تقریر کروں گا۔ اور اس بات کی وضاحت کروں گا کہ خود اختیاریت یا علیہ رو جیہ کم کی نسبت زیادہ موثر ہے اور یہ کس طرح نا انصافی کو اور حسرتناسترواد کے حقوق کو بلند یوں پر لے جاتی ہے اگر آپ کو یہ بات غیر خفیہ و معلوم ہوتی ہے تو مجھے یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ 1940ء کی قرارداد لاہور جس وقت غیر خفیہ و نظر آتی تھی۔ 1947ء میں ایک زبردہ حقیقت بن گئی تھی۔ اس مہرہ چنا گا کہ ہونا چاہئے کیونکہ ڈھاکہ بعض اوقات مضبوط ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ چنا گا کہ کے ساتھ ایک رومانی احساس بھی پایا جاتا ہے ایک گھریلے گنگ (گھڑیل) جو آپ کو تھوہر مل کے لیے ہمارا ہے۔

اے مشرقی پاکستان کے مساجد آپ کے عقائد خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ آپ نے لوگوں میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ اصول ذاتی مفاد کے راہ میں مائل ہوتے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے ڈاکٹر عبدالوحید کو ایک دفعہ کہتے سنا تھا کہ اب مغربی پاکستان فیصلہ کر سکتا ہے کہ سبھی پاکستان میں رہنا چاہئے یا نہ جانتی کی طرف کوچ کرنا چاہئے۔

پارلیمنٹ کی بحالی کے سلسلے میں ایک اچھی بات یہ ہے کہ اس سے ہماری حس حراج بھی بحال ہوگئی ہے یہ ایک ایسی خاصیت ہے جو آپ کو مشکلات میں گھرا ہوا ہونے کے باوجود "جبرانی حملہ" کرنے کے قابل بناتی ہے۔ یہ اب نوک جھبک کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جسے اخبارات کی زبان میں "اسٹیلی کی جھلکیاں" کہا جاتا ہے۔ ان کو پڑھ کر مجھے ایک پرانا قصہ یاد آ جاتا ہے جو میرے ہاشی سے تعلق رکھتا ہے سابق پنجاب کے ایک چھوٹے سے مقام پر جہاں افسروں کی بیویاں ایک دوسرے سے ملاقاتیں

کیا کرتی تھیں میرے ساتھ میرا ایک چچا زاد بھائی غمراہوا تھا۔ افسروں کی ان بیویاں میں اکثریت باری بری خواہ تھیں کی تھی۔ میرے چچا زاد بھائی نے ایک ایسی بڑی سے شادی کر لی جو امر سر کے الیگزینڈرا اسکول کی تعلیم یافتہ تھی۔ حالانکہ اس میں اس اسکول سے فارغ التحصیل ہونے والی لڑکیوں کی ہی کوئی بات نہ تھی۔ چونکہ میری بیوی دوسرے لوگوں کے ہاں ملاقات کے لیے جانے کی عادی نہیں تھیں اس لئے وہ دوسرے افسروں کی بیویاں کی ملاقات کے بعد جوابی ملاقات کے لئے الیگزینڈرا اسکول میں پڑی ہوئی اس لڑکی کو کھینچ دیتی تھیں۔ اور اس کے ہمراہ ہمارا چچا رضاعی بیٹے دیا جاتا تھا رضاعی مرناس وقت قریب پانچ برس تھی۔ یہ طریق خاصا کامیاب نظر آتا تھا۔ ایک روز میں نے رضا سے دریافت کیا کہ اس کی بیٹی یعنی الیگزینڈرا اسکول کی فارغ التحصیل خاتون انگریز خواہ تھیں کے ساتھ انگریزی میں باتیں کرتی تھیں۔ اس نے کہا جڑی طور پر۔ انگریز خواہ تھیں بھائی چلی جاتی ہیں اور چچی "نسا" کہتی ہیں یا "نکو"۔۔۔ انسانوں میں یہ مختلف پہلوئیں اجتماعی شعور کی سطح پر مختلف ادارہ میں مشترک نظر آتی ہیں۔ کل ازم میں نے فرشتوں اور بدروحوں کے کوشش موضوع پر تقریر کی تھی۔ حال ہی میں نے ایک کتاب "فیس ریڈر فیسٹین" کے بعض اقتصادیات آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی طرف سے شائع ہونے والے ایک جڑیہ ویس پڑھے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی اس جڑیہ ویس کتابوں کی تصنیف کے لیے شائع کرتی ہے یہ اقتصادیات پڑھ کر میں حیران رہ گیا ان اقتصادیات میں بتایا گیا تھا کہ شروع میں ہماری جہتوں کا ذریعہ اعلیٰ درجہ کی "مذہبی تصنیف" فرشتوں اور بدروحوں کی طاقتوں کا رعبی اور روشنی خدا پر یقین رکھنے والے اور کافروں میں امتیاز تھا۔ اب ان جہتوں کا ذریعہ اعلیٰ درجہ کی سیاسی تنظیم کے مطابق نظریاتی طور پر مقبول اور رائج اور رائج افراد کے درمیان آؤ بیٹش ہے اب شیطان کے خوف کی جگہ کیونٹ (آکر آپ سرمایہ دار ہیں) آؤ ڈاکٹر (آکر آپ کسی کالونی سے تعلق رکھتے ہیں) نے لے لی ہے۔ ہر ایک گروپ کی رائے دوسرے گروپ سے اپنی زیادہ مختلف ہو سکتی ہے کہ گروپ کے ارکان اس بات کے قائل ہو جائیں کہ دوسرے گروپ کے خلاف ہر دو کاروائی جائز ہے جس سے اس گروپ کو مجموعی اعتبار سے فائدہ پہنچتا ہو۔ اس طرح گروپوں کی آراء میں ہوجا میں کی اور دوسرے گروپوں میں آراء میں زیادہ مختلف ہوجا میں کی کہ انہیں نظر انداز کر دیا جائے گا۔ لیکن ایک حد پر طرز کے ملک میں آپ دوسرے ملکوں کی رائے کے سطح نظر انداز کر سکتے ہیں یا اس ملک میں دوسرے گروپوں کی رائے کیونکہ بے وقعت قرار دے سکتے ہیں۔

اس قسم کی دلیا میں دو بڑی ضرورتیں ہیں۔ پہلی ضرورت: جسے صفت دوسرے درجہ پر رکھتا ہے یہ ہے کہ ہر مختلف گروپ کی رائے خواہ وہ نظریاتی ہو یا جغرافیائی اسے دوسرے گروپوں کی رائے کا ممکنہ حد تک قریبی علم ہونا چاہئے اس سے ہر سے معاشرے کی ایک مجموعی رائے قائم کی جاسکے کے ذریعے بین الاقوامی حالات کا جائزہ لیا جاسکے گا۔ اگر روس ہنگری میں برطانیہ اور فرانس

سوز پر اور امریکہ کی دہائیاں کا رونا دہائیوں کے عالمی رد عمل کو پہلے سے دیکھ سکتے تھے تو ان پر بھی جارحیت نہ کرتے دوسری ضرورت ملک یا گروپ کی رائے کو ان خطرات سے آگاہ کرنے کی ہے جن میں عوام کی اجتماعی قربانی نہیں اُنہیں جتنا کہ سکتی ہیں۔ اور اس سلسلہ میں رائے عامہ بنانے والے سیاسی رہنما اور یہ نویس جیسے نگار اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ لوگ عوام کے جذبات اور غیر متعلق رجحانات سے پوری پوری آگاہی رکھتے ہیں اور رائے عامہ کی زیادہ متوازن اور با مقصد رجحانات کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور اس طرح اسے شدید تر نوعیت کے رد عمل کا مظہر ہونے سے محفوظ رکھتے ہیں مدد دیتے ہیں۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں اشتقاق نظریات پائے جاتے ہیں۔ ننگی اور بین الاقوامی رائے عامہ انہماک کا ایک سد باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن رائے عامہ کے موثر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں اس کا فیصلہ عام اخلاقی ضابطے سے مطابقت رکھتا ہو۔ نئی نوع انسان کے لیے عمرانیات میں کوئی شے بھی دوسرے گروہوں اور دوسری قوموں کی نفسیات اور معاشرتی عادات کے مطالعہ سے زیادہ اہم نہیں ہے۔ غواجمین و حضرات! قصہ مختصر آپ کا سیاسی مسلک خواہ کچھ ہی ہو اور اس امر سے قطع نظر کہ رائے عامہ پائی کی طرح اپنی سطح ہمارے رکھتی ہو اس کی رہنمائی اور تشکیل آپ کے اپنے نظریات اور دوسرے ممالک کی رائے عامہ سے ہوتی ہے اس بات کو ابھی طرح یاد رکھیں کہ ایک مضبوط رائے عامہ یہ ہے جو انجام کار آپ کے لیے ایک باوقار حیثیت اور غیر ممالک میں ایک دوستانہ درجہان پیدا کر سکتی ہے۔ اور یہاں ڈاکٹر عبدالوحید اپنے پینٹنگ ہاؤس کے ساتھ درآئے ہیں انہوں نے میں جہوں کے اپنے پاسٹا سے میں سے سات ہیڑے اعلیٰ خیال کی آزادی کی تاریخ کے لئے وقف کیے ہیں جو ان کے ہر سوجھ بوجھ پر پہنچ ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا ہے ”اُعلیٰ خیال اور تقریر کی آزادی کے حقوق ایسی بنیادی لازمی چیزیں ہیں جن کے بغیر صنعت اشاعت کا فروغ یا ناکوفاؤدانہ وجود بھی برقرار نہیں رکھ سکتی۔ میرے خیال میں مجھے اسے ”اشاعت کی سائنس“ کا نام دینا چاہیے کیونکہ اگر اس کی طرف ایک سائنس دان کے تجرباتی جذبہ سے کہ ساتھ رجوع نہ کیا جائے تو بین کی تمام قدروں سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر وحید نے کہا ہے کہ ان کے پرچم اور پینٹنگ ہاؤس کی راولپنڈی شاخ کا افتتاح کرنے پر میرا رضامند ہونا اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ انہوں نے پیش رفت کی حیثیت سے قومی شعور کو اجاگر کرنے میں اور رائے عامہ کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ باقی میں اس سائنس دان کی ایک نقل موصول ہونے پر میں نے حذر کے حقیقت کا اعتراف کیا تھا انہیں۔ لیکن میں بعض شرائط پر مشتعل میں اس کا اعتراف کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تاہم مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ انہوں نے مجھے جو پہلا روحانی ٹھکانا تھا۔ اس سے مجھ میں اشاعت و مطابقت کے بارے میں قومی شعور ضرور پیدا ہوا۔ حالانکہ یہ واقعہ آٹھ جنوں سے یعنی قومی شعور کے مقررہ دن سے پہلے کا

ہے۔ میں واضح طور پر نہیں کہہ سکتا کہ جب الوطنی کے کسی جذبہ نے مجھ پر اضطراری کیفیت طاری کی کیونکہ شیطان کو بھی آدمی کے دل کی بات کا علم نہیں اور صرف اپنے ہی دل کی بات کا عمل ہوتا ہے۔ میں ڈاکٹر وحید کو پہلے سے جانتا ہوں۔ میں نے ان کا ڈراما تنگ روم بھی دیکھا ہے۔ اگرچہ مجھے ڈاکٹر تنگ روم اور ڈراما تنگ روم کے درمیان گھومتے والے دروازے کو گھومتے ہوئے دیکھے عرصہ ہو چکا ہے۔ لوگوں کو یہ بتانے کے لیے کہ گھومنے کا سلسلہ ابھی تک بڑے اچھے طریقے پر جاری ہے۔ آدمی کو ایسے دروازے آکھڑ کیونکہ چائیں لیکن میں ان کے بارے میں قومی شعور کے حامل فرد کی بجائے وزیر اعلیٰ کے طور پر سوچا کرتا تھا اور بعض اوقات میں یہ سوچا کرتا تھا کہ وہ مطابقت و اشاعت جیسی مقابلیات حقیر تجارت سے کیوں چپے ہوئے ہیں لیکن جب میں نے گھومتے والے دروازہ دیکھا تو میں نے خیال کیا کہ اس تجارت میں کچھ اور معنویت پوشیدہ ہے اور ایک روز جب میں لاہور میں داخل ہوا اور کتابوں کی دنیا کی مسرتوں سے بہرہ ور ہونے کا موقع میرے خیالات میں تہہ ملی آگئی۔ اور میں نے کہا اس میں اور بھی معنویت پوشیدہ ہے۔ اگر میں تکبر اور حقارت کے جذبہ کے بغیر اپنے دماغ کا تجزیہ کروں تو میرے قریب قوت اشعوری کیفیت۔

..... جب مجھے ان کا خط موصول ہوا۔ خط کے مندرجات کا انکشاف کے بغیر میں اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ اس سے مجھے ایک خوش گوار بے چینی کا احساس ہوا۔ یہ احساس کہ آسمان اور زمین پر ہو رہی شے جو ہے ان لوگوں کی تعداد ہمارے علم سے کہیں زیادہ ہے جو درود کا مظہر ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ایک بظاہر دور سے مبرا زندگی پر سکون و قار کے ساتھ برداشت کرتے ہیں اور انہیں اتنی بھی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکیں۔ جب مجھے اذان میں اس قسم کی انسانی جھلک دکھائی دیتی ہے تو میں اپنے آپ کو درود رتھ (WORDSWORTH) کی نظم سناؤں کی طرح محسوس کرتا ہوں جس کی آنکھوں میں اس وقت فکر کے آنسو سر آئے تھے۔ جب اس پر کوئی چھوٹا موٹا احسان کیا جاتا تھا مثلاً کلباڑے کی آٹھ یا نو سو روپے اس کے لیے کسی چھوٹے سے درخت کا کاٹ دینا۔ میرے لیے یہ اسباب باعث طہارت ہے کہ قومی شعور ایک ایسے شہد زندگی میں رواں دواں ہو گیا ہے جس کے بارے میں اس امر کو وہ مان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

اب میں اس کی تعریف کروں گا کہ ایک پیش رفتی بیاداری کی اشاعت کے سلسلے میں کس قدر مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ فی الحال قومی اسٹیبلشمنٹ میں یا قومی اسٹیبلشمنٹ سے باہر کی جانے والی تقریروں کو دیکھنے میں بعض نے آپ میں قیامت ڈمداوی اور اس وسیع طبع کا شعور پیدا کیا ہے جس کو تیر کر پار کرنے سے ہی ہمیں دوسرے کنارے پر عالمی رائے عامہ مل سکتی ہے۔ اگر یہ تقریریں صرف متعلقہ سامعین تک ہی محدود رہیں اور شائع نہ کی جاتی تو ملک کو ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوتا اور ذہنی غذا جو مضبوط رائے

اطلاع دی کہ اس نے میری ایک طویل تقریر شائع کی ہے۔ اس نے مجھ سے یہ چما کر کیا آپ کے پاس کوئی اور تقریر ہے۔ مجھے کہنا پڑے گا کہ اس نے کس سبب ایک ایسے بلیشر کاظم ہونے سے نفرت کا احساس ہوا ہو۔ ایک وسیع قلبی پس منظر اور اعلیٰ ثقافتی اہلیت کا حامل ہے اور جس نے بذات خود اس سبب سے پہلے ایک باصلاحیت شخصیت کا پتہ چلا یا تھا۔ اور اگر بلیٹیوں میں جہاد کر دیتا تو میں اس شخص سے نقل گیر ہو جاتا جس کی قوم پرستی اور حب الوطنی نے اس پر دات ہے کس سبب سے بلیٹی طاری کر دی تھی لیکن شیطان نے میرے کان میں سرگوشی کر کے مجھے شک میں ڈال دیا اور یہ شہر کرتے ہوئے کہ وہ قوم کی بلا معاوضہ خدمت میں کر رہا۔ میں نے اس سے یہ چما کر کیا وہ اس تقریر کو جو اس نے طبع کی ہے فروخت کر رہا ہے۔ اس نے کہا ”جی ہاں! میں اسے فروخت کر رہا ہوں۔ اور میں نے اس کی قیمت ایک آدنی جلد کر لی ہے۔ میں نے چلا کر کہا۔ ”بہت میرے عقیم سیکھوں کی تھی مجھے ایک آدنی فروخت کر رہا ہے۔“ وہ چند نکلون تک خاموش رہا گو یہ کہ اس کو بہت حیرت ہوئی اور پھر اس نے بڑے جھروانہ لہجے میں میں کہا ”کیا میں اس کی قیمت چار لے کر دوں؟“

اس نے مجھے نئے جلدیں رائلٹی کے طور پر بھجوا دیں۔ میں یہ قصہ یہاں اس لئے بھرا رہا ہوں کہ ڈاکٹر وحید کے ذہن سے وہ بات خارج کر دوں جو انہوں نے اپنے ایڈیٹر سے کہہ کر دوں ان کی تھی۔ ”ہو سکتا ہے کہ کتب و رسائل کی تجارتی میرے لئے مادی منفعت کا باعث نہ ہو۔“ میں بلا شہرہ اس کی طریق پر پیچھے سے کہنے کا خواہش مند ہوں اور اس امر کا یقین کرنے کے لئے میرے انجکشن نے آزمائشی طور پر میری کتاب کی طاعت کا کام پھیلایا فیروز سنز کے سپرد کر دیا ہے۔ جب طاعت ہو جائے گی تو وہ ایک اور آزمائشی کے طور پر اس کی فروخت کا کام بھی فیروز سنز کے سپرد کر دیں گے تاکہ آزادی تقریر اور آزادی اشاعت کے درمیان مزید یکجہت پیدا ہو جائے۔

مجھے اس خوش آمدید خیال پر ہی اپنی تقریر ختم کر دینی چاہئے لیکن ایڈیٹر میں ایک چھوٹ سا سیڑا ایسا ہے جو کہ ایک بڑا وہ خوش کن نہیں ہے۔ یہ یہ چند وہی اس ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ طاعت و اشاعت کی صنعت کو ”بحران در بحران“ کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جس کا باعث حکومت کا سوشل مال کا سلسلہ ہے۔ اس بات کا خصوصی اشارہ حکومت کے اس فیصلے کی طرف ہے جس کا مقصد ابتدائی درجہ سے اعلیٰ ثانوی سکول کے درجے تک کتابوں کی ترقیب و تدوین طاعت و اشاعت اور اس طرح نصابی کتابوں کے شعبوں میں اہل ادارہ داری قائم کرنا ہے۔ دیکھا تو فاقہ نصابی کتب سے متعلق سیکڑل سننے آئے ہیں لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ان سیکڑلوں کے ذمہ دار ناشرین ہیں یا سرکاری ایجنٹ۔ تاہم سرکاری ادارہ داروں کے سلسلے میں عمومی طور پر خوش آمدید تو تعات

عام بنانے کے لیے ضروری ہے قوم کو مدنی۔ جب ہوتا تھا کہ بلیشر کو کیوں ایک ایسی چیز پر تھے مصطفیٰ لکھتا ہے اور پھر چھاپتا ہے بلیشر کی اجازت دی جاتی ہے۔ لیکن میں نے ایک جگہ ایک مضمون پڑھا تھا کہ اشاعت کو ناہنگوں اور بی کاموں کی تجارت ہے۔ اور جدید زمانے کے بلیشر کا کام مصطفیٰ کے قائمہ کے لیے اور بی کاموں سے تجارتی استفادہ حاصل کرنا ہے۔ اور بی استفادہ بہت بڑا سرمایہ ہے اور جب اسے خوشامد سے ملوث نہ کیا جائے تو قومیت کے سلسلے میں لڑیاں کروا دیا کرتی ہے۔ گزشتہ چار برس میں جو اچھی کتابیں شائع ہوئی ہیں میں نے ان کے دسویں یا پندرہویں صفحے سے آگے نہیں پڑا۔ کیونکہ ان میں بعض بڑے آدمیوں کے لیے خوشامد نہ حوالے استعمال کیے گئے ہیں۔ پرانی کتابوں میں کم از کم ایک غوطی ہوتی تھی۔ وہ یہ کہ ان میں مختلف ابواب یا نامے جاتے تھے۔ پہلا نامہ دوسرا نصرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیسرا بادشاہ کی مدح میں۔ چوتھا اپنے دشمن کی تعریف میں۔ اور اگر آپ کو تقسیم ابواب کے اس طریقے سے یہ معلوم ہو گیا کہ خود خدائی کی ذات عظیم ہے اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی اس عظمت و جلالت کے روحانی مظہر ہیں اور بادشاہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے جلال کا مظہر ہے تو ان ابواب سے آپ جلدی جلدی گزر کر میں کہانی تک پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن پاکستان کے جدید دور میں آپ کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آسمانی روشنی۔۔۔ جو نہ سمندر میں موج رہے اور نہ زمین پر کب آپ کی آنکھوں کو بخیرہ کر دے گی۔ میرا خیال ہے کہ اچھے ناشرین کو ایسی کتابیں قبول کرنے سے انکار کر دیتا چاہئے۔ کیونکہ ان پر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ انیس وسیع قلبی پس منظر اور اعلیٰ ثقافتی جاہر کا حامل ہونا چاہیے تاکہ وہ عوام کی صلاحیتوں کو تھادہ ہونے سے بچا سکیں۔ ڈاکٹر وحید نے مجھے ایک انٹرنیشنلیشن دیا تھا۔ جس میں میں نے یہ فقرے پڑھے کہ پاکستان میں کی مستند مصنف موجود ہیں مگر چند ایک جو طوطے سے علم میں اضافہ کے لئے ساقی کر رہے ہیں ان کی بیشتر بلیشروں کے درجے سے حوصلہ شکنی ہو رہی ہے بعض مصطفیٰ اپنے خرق پر اپنے مسودات شائع کرنے لگے ہیں اور بعض مصنفوں کو اپنے وقت اور محنت کے شیعار کے باوجود جلی طور پر ہتھوڑا دیکھ کر ہتھوڑا پھینکتا۔ جب میں نے یہ پڑھا تو میں نے یہ خیال کیا کہ میرے دل میں جو جذبات تھے وہ بھی تھے کیونکہ گزشتہ دو تین سال کے دوران ایک کے سوا کسی مصنفوں نے مجھے بتایا ہے کہ اگر بلیشر کتاب کے دو ہزار لے چھوڑے تو وہ ہمیشہ آپ سے یہی کہے گا کہ ابھی یہ فروخت نہیں ہوئے بلکہ جو نئے فروخت ہوئے ہیں وہ مصنف کو بتائے بغیر شائع کیے گئے ہیں۔ ایک مصنف جو اس سے متعلق تھا وہ قاضی کی کتاب فیروز سنز نے شائع کی تھی۔ اور مجھے اسے بھیج کر نے کی اجازت دیجئے کہ یہ ہمیں اطلاقی بات ہے اور یہ تمام بڑے ادارے قدرتی طور پر ان کی شہرت سے حسد کریں گے۔ ان کے ذہن میں وہ بلیشر نہیں تھا جس نے ایک رات دس بیچے کے بعد مجھے بلیٹیوں کیا اور بڑے اطمینان سے مجھے یہ

واپس کرنا ممکن نہیں۔ ایسا کوئی کام نہیں جس کی انجام دہی کے سلسلے میں سرکاری ایجنٹوں نے فحشی صنعت کاروں جیسی حزم و احتیاط سے کام لیا ہو۔ یہ لوگ سونے کو تاننا دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرکاری ایجنٹوں کو باقاعدگی سے ماہ چھ ماہ ملتی ہے۔ اور محض احساسِ فرض ان کے غیر حساس دلوں کے قریب نہیں پہنچتا۔ عدالت عالیہ کو سرکاری طباعت کا قدرے تجربہ ہے اور اس کی برکت سے ان غلطیوں کے علاوہ جن کی ہماری کتابوں میں بھرمار ہوتی ہے۔ سرکاری قانونی رچ رتیں اس وقت زبحِ طبع سے آراستہ ہوتی ہیں جبکہ اس موضوع پر فحشی رچ رٹوں کو طبع ہونے چھ ماہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ بادشاہِ حکومت اجارہ داری کے شعبے میں اپنے ایجنٹوں کے کارہائے نمایاں سے ناواقف ہوگی جو اس نے ایک نیا جامہ زیب تن کیا ہے۔ لیکن اگر وہ اشاعت کی سائنس سے متعلق ارارے ہے اور اپنے پرانیے کپڑوں کو ڈرائی ٹیکن کرنا چاہتی ہے۔ تو ڈاکٹر وحید اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن ان کی خدمات قبول کی جائیں یا نہ کی جائیں مجھے اس امر کا یقین ہے کہ وہ اشاعت اور کتاب فروشی کے چھٹے کوڑک نہیں کریں گے۔ ان کے والد اور دادا بھی یہی پیشِ اختیار کیے۔ میرے والد نے مجھے دم کے ایک شدید حملے کے بہت جلد بعد باغش میں کام کرتے دیکھا۔ اور جب میرے چلنے سے کہہ کر ان کی تو جاس امر کی جانب مبذول کرانی کہ مجھے حمل سے کام لے کر ایک ہفتہ تک آرام کرنا چاہئے تو میرے والد نے باپ ہی کے عالم میں کہا کہ ”وہ مجبور ہے اس کا دادا بھی باغیان تھا۔“

خواتین و حضرات! آپ میں رسم افتتاح کی ادائیگی کے لیے تیار ہوں۔

